مطبوعاتِ مجلسِ یادگارِ غالب
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۴

تنقیدِ غالب کے سو سال

مطبوعاتِ مجلسِ یادگارِ غالب
پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۱۴

تنقیدِ غالب کے سو سال

مرتبہ:

گروپ کیپٹن سید فیاض محمود

اقبال حسین

۱۹۶۹

تنقیدِ غالب کے سو سال

ترتیب

مجلسِ یادگارِ غالب، پنجاب یونیورسٹی (۹)

پیش لفظ

علاءالدین صدیقی (۱۱)

تعارف

حمید احمد خاں (۱۳)

دیباچہ

سید فیاض محمود (۱۷)

۱- مرزا غالب

اقبال ۱

۲- دیباچۂ اردوئے معلّٰی (۱۸۶۹ء)

میر مہدی مجروح ۳

۳- غالب میرزا اسداللہ خاں دہلوی (۱۸۷۶ء)

سید محمد صدیق حسن خاں ۷

۴- غالب (۱۸۸۱ء)

سید نورالحسن خاں ۹

۵- غالب (۱۸۷۹ء)

امیر احمد امیر مینائی ۱۱

۶- نجم‌الدولہ دبیرالملک مرزا اسداللہ خاں غالب (۱۸۸۰ء)

محمد حسین آزاد ۱۳

۷- غالب علیہ‌الرحمۃ (۱۸۸۴ء)

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ۳۳

۸- مرزا کے کلام پر ریویو (۱۸۹۷ء)
الطاف حسین حالی ۳۷

۹- غالب (۱۸۹۷ء)
سید امداد امام اثر ۷۰

۱۰- ختم الشعرا میرزا نوشہ (۱۹۰۳ء)
میرزا حیرت دہلوی ۸۰

۱۱- غالب (۱۹۱۲ء)
صلاح الدین خدا بخش ۸۳

۱۲- مرزا غالب دہلوی کی شاعرانہ عظمت (۱۹۱۲ء)
پیارے لال شاکر میرٹھی ۹۳

۱۳- غالب کا فلسفہ (۱۹۱۳ء)
عبدالماجد دریا بادی ۱۱۳

۱۴- محاسنِ کلامِ غالب (۱۹۲۱ء)
عبدالرحمٰن بجنوری ۱۲۳

۱۵- مرزا اسداللہ خاں غالب (۱۹۲۱ء)
سید عبدالحئی ۱۵۴

۱۶- غالب کا فلسفہ (۱۹۲۵ء)
سید ہاشمی فرید آبادی ۱۵۷

۱۷- غالب کی شاعری (۱۹۲۸ء)
سید عبداللطیف ۱۸۵

۱۸- غالب کی شاعری کے چار دور (۱۹۳۶ء)
شیخ محمد اکرام ۲۰۶

۱۹- غالب کی شاعری میں حسن و عشق (۱۹۴۹ء)
حمید احمد خاں ۲۳۲

۲۰- غالب کی عظمت (۱۹۴۹ء)
آل احمد سرور ۲۷۷

۲۱- مقدمہ خطوطِ غالب (۱۹۵۱ء)
غلام رسول مہر ۲۹۰

۲۲- غالب کا تفکر (۱۹۵۲ء)
احتشام حسین ۳۲۳

۲۳- غالب کا نظریۂ شعر (۱۹۵۳ء)
وحید قریشی ۳۶۲

۲۴- غالب کی عظمت (۱۹۵۳ء)
خواجہ احمد فاروقی ۳۷۵

۲۵- نقش ہائے رنگ رنگ (۱۹۵۵ء)
ابواللّیث صدیقی ۳۸۴

۲۶- غالب کی مثنوی نگاری (۱۹۶۱ء)
نیاز فتحپوری ۴۰۵

۲۷- مولانا آزاد بنام غالب (۱۹۶۲ء)
مالک رام ۴۲۴

۲۸- غالب کے کلام میں استفہام (۱۹۶۳ء)
فرمان فتحپوری ۴۴۳

۲۹- غالب کی عظمت (۱۹۶۵ء)
عبادت بریلوی ۴۵۹

۳۰- غالب : ایک مابعدالطبیعاتی شاعر (۱۹۶۶ء)
احمد علی ۴۷۴

۳۱- کلام غالب کا ایک رخ (۱۹۶۸ء)
اسلوب احمد انصاری ۴۸۳

۳۲- غالب نئی داخلیت کی آواز (۱۹۶۸ء)
محمد حسن ۵۲۲

۳۳- غالب کی فارسی شاعری (۱۹۶۸ء)
سید محمد عبداللہ ۵۲۶

۳۴- کلامِ غالب میں تمثال شعری کا مقام (۱۹۶۹ء)
اختر اقبال کمالی ۵۵۶

۳۵- غالب کی غزلوں میں قیس و فرہاد کا تصور (۱۹۶۹ء)
سید وقار عظیم ۵۹۱

۳۶- ضمیمہ ۶۱۳

(الف) اسداللہ خاں اسد (۱۸۲۱ء)
میر محمد خاں سرور ۶۱۵

(ب) اسداللہ خاں (۱۸۳۷ء)
محمد مصطفٰے خاں شیفتہ ۶۲۰

(ج) اسد (۱۸۴۵ء)
کریم الدین ۶۲۲

(د) تقریظ دیوانِ ریختہ اسداللہ خاں غالب (۱۸۴۷ء)
سرسید احمد خاں ۶۲۳

(ہ) میرزا اسداللہ خاں (۱۸۵۵ء)
مرزا قادر بخش صابر ۶۲۷

مجلسِ یادگارِ غالبؔ

★

صدرِ مجلس

پروفیسر حمید احمد خان ستارۂ پاکستان / ستارۂ امتیاز وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور

ارکان

جناب عبد الرحمٰن چغتائی لاہور

مولانا غلام رسول مہرؔ لاہور

پروفیسر ڈاکٹر سعید اللہ سابق صدر شعبۂ فلسفہ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور

سید امتیاز علی تاجؔ سیکرٹری مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور

مولانا حامد علی خان، مدیر مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن لاہور

کیپٹن عبد الواحد مؤسسۂ مطبوعاتِ فرینکلن لاہور

ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمٰن، سابق چیف جسٹس پاکستان لاہور

پروفیسر ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد صدر شعبۂ امورِ طلبا پنجاب یونیورسٹی لاہور

گروپ کیپٹن سید فیاض محمود ناظم شعبۂ تاریخِ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

پروفیسر ڈاکٹر سید عبد اللہ صدر دائرۃ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ناظم ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج و صدر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور

سیّد وقار عظیم غالب پروفیسر اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

سیّد وزیر الحسن عابدی، ریڈر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور

جناب احمد ندیم قاسمی، مدیر مجلّہ فنون لاہور

پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی، صدر شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

جناب صفدر میر، روزنامہ پاکستان ٹائمز لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل، صدر شعبۂ نفسیات، گورنمنٹ کالج لاہور

پروفیسر اختر اقبال کمالی، شعبۂ انگریزی اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور

ڈاکٹر وحید قریشی، ریڈر شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

جناب انتظار حسین، روزنامہ مشرق لاہور

جناب اقبال حسین، شعبۂ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

معتمد

ڈاکٹر آفتاب احمد خاں، جائنٹ سیکرٹری وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان ڈھاکہ

ڈاکٹر عبدالشکور احسن، ریڈر شعبۂ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور

نائب معتمد

سیّد سجاد باقر رضوی، لیکچرر انگریزی، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

پیش لفظ

مجلسِ یادگارِ غالب کا قیام پنجاب یونیورسٹی کے ایک فیصلے کے مُطابق عمل میں آیا اور پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اس کے صدر مُقرر ہُوئے۔ مجلس نے غالب کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے جو کتابیں شائع کرنے کا منصُوبہ بنایا تھا اُنھیں مَیں غالب شناسوں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہُوں۔

یُونیورسٹی کے ایک اَور فیصلے کی رُو سے شعبۂ اُردُو میں کُرسیِٔ غالب قائم ہُوئی۔ مَیں مسرّت کے ساتھ اعلان کر رہا ہُوں کہ اِس اسامی پر پروفیسر سیّد وقار عظیم کا تقرر کیا جا چُکا ہے۔

(پروفیسر) علاءُ الدّین صِدّیقی
وائس چانسلر، جامعۂ پنجاب

سینٹ ہال
مارچ ۱۹۶۹ء

لاہور

تعارف

★

فروری ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی وفات پر ایک سو برس پورے ہو رہے ہیں۔ اِس موقع کی مناسبت سے پنجاب یونیورسٹی نے شاعر کی عظمت کے اعتراف کے طور پر نہ صرف شعبۂ اُردو میں ایک پروفیسر کی نئی اسامی "کرسیٔ غالب" قائم کی ہے، بلکہ مجلس یادگارِ غالب کے تعاون سے ایک سلسلۂ مطبوعات شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ یہ کتاب اِسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مجلس یادگارِ غالب کے قیام کی تحریک جنوری ۱۹۶۷ء میں ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے کی۔ وہ مجلس کے پہلے معتمد اور سید سجاد باقر رضوی شریک معتمد مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خان کے لاہور سے ڈھاکے منتقل ہو جانے پر ڈاکٹر عبادت بریلوی؟ ڈاکٹر عبداللہ کو راحسن مجلس کے دوسرے معتمد قرار پائے۔

اواخر ۱۹۶۸ء میں جب ہمارا سلسلۂ کتب طباعت کے مرحلے میں داخل ہوا تو صدرِ مجلس کو ڈاکٹر محمد باقر کی مسلسل اعانت اور مشورہ بھی قدم قدم پر میسّر رہا۔ جن اربابِ فکر و نظر نے مجلس کی درخواست پر اِس سلسلۂ کتب کی ترتیب، تالیف یا تصنیف میں حصّہ لیا اُن میں سے ہر ایک کا نام متعلقہ کتاب کے سرورق

کی زینت ہے۔ مجلسِ یادگارِ غالب کے ارکان کے ناموں کی پوری فہرست اِس کتاب کے شروع میں الگ شائع کی جا رہی ہے۔

مجلس کے سلسلۂ مطبوعات میں سب سے پہلے مرزا غالب کی تصانیف آتی ہیں جو اُردو اور فارسی نظم و نثر پر مشتمل ہیں۔ یہ تصانیف نفسِ مضمون کی رعایت سے یا موزونی ضخامت کا لحاظ کر کے مختلف جلدوں میں تقسیم کر دی گئی ہیں۔ اِن سب کتابوں پر مؤلفین نے دیباچے لکھے ہیں اور حسبِ ضرورت حواشی کا اضافہ بھی کیا ہے۔ نیز جہاں تک ممکن ہو سکا دستیاب وسائل کی مدد سے ہر متن کی تصحیح کی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غالب کی تصانیف میں سے کوئی کتاب رہ نہ جائے۔ چنانچہ اُن کی بعض نگارشات جو مرورِ زمانہ سے تقریباً ناپید ہو چکی تھیں، اب پھر اہلِ نظر کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہیں۔ دیوانِ غالب کا نسخۂ حمیدیہ، جسے صدرِ مجلس نے مرتب کیا ہے، ایک پہلے فیصلے کے مطابق مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔ غالب کی صرف یہی ایک کتاب مجلس یادگارِ غالب کی مطبوعات میں شامل نہیں۔

مرزا غالب کی تصانیف کے علاوہ مجلس کی مطبوعات میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن میں اِس یگانۂ روزگار کے شخصی، فنی اور فکری کمال کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو انگریزی دان لوگ اُردو نہیں جانتے انہیں

غالب کے فکر وفن سے متعارف کرنے کے لئے ایک مفصّل کتاب انگریزی زبان میں شائع کی جا رہی ہے۔ ایک اور کتاب میں غالب پر شائع شدہ مواد کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ پھر اس سوال کا جواب کہ "میں نے غالب سے کیا پایا" ایک تیسری کتاب کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس میں متعدد غالب شناس حضرات کے ذاتی تاثرات جمع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مجموعے میں گذشتہ ایک سو برس کی تنقیدِ غالب کا خاکہ اقتباسات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتابیں فروری ۱۹۶۹ء میں شائع ہو رہی ہیں۔ گویا ان کی تاریخ اشاعت سے مرزا غالب کی حیات بعدِ ممات کی دوسری صدی شروع ہوتی ہے۔ مجلس کو یقین ہے کہ اس دوسری صدی میں غالب کے قبولِ عام کی سرحدیں کچھ اور وسیع ہو جائیں گی۔ خدا کرے کہ دنیا کو ہند اسلامی تمدن کے آخری ترجمان سے روشناس کرانے میں مجلس کی یہ سعی رائگاں نہ جائے۔

حمید احمد خاں
صدر مجلس یادگار غالب
جامعۂ پنجاب، لاہور

سینیٹ ہال
فروری ۱۹۶۹ء

دیباچہ

مرزا اسداللہ خان غالب ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرہ کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئے اور ۷۳ برس کی عمر پا کر ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو وفات پا گئے - ان کے دادا، والد، چچا اور نانا فوج میں افسر تھے - عسکری روایات، خاندانی عظمت اور ریاست کا احساس اورآن پر فخر ان کے خاندان کے مزاج میں داخل تھا - بچپن میں یتیم ہو جانے کی وجہ سے اپنے نانا خواجہ غلام حسین کمیدان کے ہاں پرورش پائی - یہ آگرے کے ایک معزز اور متموّل شخص تھے اور انھوں نے مرزا اسد اللہ خان کی، جو تا شباب مرزا نوشہ کہلاتے تھے، بڑے پیار سے پرورش کی -

مرزا کی طبیعت میں آزادی قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی، اس لیے تعلیم میں، اپنے حلقۂ احباب کے انتخاب میں، اپنے مشاغل میں، وہ کسی رواج کے پابند نہ تھے - شعر و شاعری کا شوق انھیں لڑکپن سے تھا اور مستند روایات، بلکہ خود مرزا کے اپنے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ غالباً بارہ برس کی عمر میں شعر موزوں کر لیا کرتے تھے اور پندرہ برس کی عمر میں اچھے شعر کہہ لیتے تھے - اپنے مزاج اور شخصیت کی افتاد کے باعث مبتذل اور عامیانہ مضمون باندھنا انھیں ناگوار تھا - غالباً اپنی فوقیت جتانے کی غرض سے یا قدرتی طور پر اپنی جودتِ طبع، تازگئی فکر اور صداقتِ جذبات کے اظہار کے لئے شعر میں فکر آمیز تأثر کو پسند کرتے تھے - چونکہ اٹھارھویں صدی کے آخری بیس سالوں میں مرزا نجف خان کی وفات (۱۷۸۲ء) کے بعد اور مرھٹوں کے دھلی میں تسلط کے باعث لوگ شاید غوامضِ حیات اور زندگی کے بھیانک پہلوؤں پر بحث کرنے سے گریز کرتے تھے، اور معمولاتِ زندگی کے بیان یا حسین اور خوش آئند یا محض تفریحی تاثر سے لبریز جذبات کے

اظہار کو روایتِ شعری کا بنیادی عنصر قرار دے چکے تھے، اس لئے اس زمانے میں زود فہم اشعار اور جانے پہچانے جذبات کو غور طلب اور ہیجان انگیز اشعار سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا کا اسلوب لوگوں کو پسند نہ آیا۔ مرزا کے اشعار میں جذبات کے بانکپن کے علاوہ اظہارِ بیان کی انفرادیت اور تخیل انگیز فکر کی آمیزش شروع سے موجود تھی۔ یہ درست ہے کہ ان کے اشعار میں ابلاغ کا پہلو اس قدر وقیع نہ تھا جتنا اس زمانے میں شعر کا تقاضا سمجھا جاتا تھا، مگر جذبات کی شدت، احساس کی وسعت، تجربات حیات کا تنوع اور فکر کی گہرائی ایسی خصوصیات تھیں جنھوں نے شروع ہی سے مرزا کی شاعری کے بارے میں دنیائے ادب میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

چونکہ مرزا کی شاعری کی وجہ سے برصغیر کی ثقافتی دنیا میں ایک ذہنی ارتعاش کا ظہور ہوا، اس لئے غالباً ہر عشرہ میں ان پر کچھ نہ کچھ تحریر کیا گیا اور اب جس وقت انھیں فوت ہوئے ایک سو سال گذر چکے ہیں، ان سے متعلق لاکھوں الفاظ لکھے جا چکے ہیں۔ اس کتاب کے مرتب کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ان سینکڑوں کتب اور مقالات میں سے ایسی نگارشات کا انتخاب کیا جائے، جن سے قارئین کو یہ معلوم ہوسکے کہ غالب شناسی کن کن مدارج سے گذری اور ان سو سالوں، بلکہ غالب کی زندگی میں ہی، مرزا کی شاعری، ان کے فن اور ان کے نظریۂ حیات کے بارے میں لوگوں کے خیالات اور احساسات کیا تھے۔

جب اس وسیع مواد کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ پہلی مقتدر کتاب جس میں مرزا کے کلام سے ناقدانہ انداز میں بحث کی گئی ہے، ''آب حیات'' ہے جو ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی۔ مگر مولانا محمد حسین آزاد کا اندازِ نقد و نظر تعصب سے خالی نہ تھا اور جو طنز آمیز اسلوب انھوں نے مرزا کے متعلق اختیار کیا اس سے نہ تو مرزا کی شخصیت اور

نہ ہی ان کی شاعری کی خصوصیات اجاگر ہوئیں ۔ اس کے سترہ سال بعد یعنی ۱۸۹۷ء میں یادگارِ غالب طبع ہوئی ۔ اس میں مرزا کی شخصیت اور شاعری پر سیر حاصل بحث موجود ہے ۔ اس کے پندرہ سال بعد یعنی ۱۹۱۲ء میں صلاح الدین خدا بخش کا مضمون انگریزی زبان میں شائع ہوا ۔ ''محاسن کلامِ غالب'' کا سال اشاعت ۱۹۲۱ء ہے اور ڈاکٹر عبداللطیف کی انگریزی میں غالب پر کتاب ۱۹۲۸ء میں چھپی ۔ مگر غالب شناسی کا نیا دور دراصل شیخ محمد اکرام صاحب کی کتاب ''غالب نامہ'' مطبوعہ ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتا ہے ۔ اس کے بعد تنقیدات غالب میں تیزی سے اضافہ ہوا جو اب تک جاری ہے ۔ گویا اگر ۱۸۶۹ء سے ۱۸۹۷ء تک کی مدت کو پہلا دور تصور کیا جائے تو ۱۹۳۵ء کو دوسرے دور کی حدِ فاصل قرار دینا مناسب ہوگا ۔ تیسرا دور ۱۹۳۶ء سے تا حال کا ہے ۔ اس میں غالب شناسی بہت سے مراحل سے گذری ہے اور غالب کے کلام اور فن پر بہت سے تنقیدی زاویوں سے بڑے بڑے فضلا نے بحث کی ہے ۔

ہم نے کوشش کی ہے کہ ہر تنقیدی نقطۂ نظر کی نمائندگی ہو تا کہ تنقیدِ غالب کی یہ تاریخ جامع اور معنی خیز ثابت ہو سکے ۔ وہ تنقیدی زاویے جو اس وقت مقبول ہیں یا تنقیدی دنیا میں مسلمات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں، تعداد میں پانچ ہیں ۔ ان کے بارے میں اجمالاً کچھ کہہ دینا ضروری ہوگا ۔

(اول) اظہاریہ : اس میں حسن بیان پر زور دیا جاتا ہے اور الفاظ کا انتخاب، ان کی استعاریت، تراکیب کی تراش خراش بلکہ صنائع و بدائع کا مؤثر استعمال معیار قرار دیے جاتے ہیں ۔

(دوم) مقصدی : اس تنقیدی زاویے کی رو سے شعر کی خوبی اس مقصد پر منحصر ہے جس کی بنا پر، یا جس کے تحت، شاعر

نے اپنے تجربۂ حیات کو پیش کیا - یہ زاویۂ نگاہ شعر کو حسن آفرینی یا محض معنی خیزی یا تعبیر حیات کے لیے کافی نہیں سمجھتا -

(سوئم) تاثراتی: اس کے پیرو اپنے تاثر کو شعر کی اپنی حیثیت پر مقدم سمجھتے ھیں - ان کے نزدیک نقاد کو حق حاصل ھے کہ وہ شعر کے مطالب یا اس کی اھمیت کو ان تاثرات کی عینک سے دیکھے جو خود شعر پڑھتے وقت ان پر وارد ھوتے ھیں - اس تنقید میں داخلیت کا حصہ غالب ھوتا ھے، مگر اس قسم کے نقاد یہ جائز سمجھتے ھیں کہ اپنی پختہ نظری کو پرکھ کی کسوٹی کے طور پر استعمال کریں -

(چہارم) نفسیاتی: یہ زاویہ دنیائے ادب میں فرائیڈ اور مابعد کی نفسیاتی تحقیقات کے نتیجہ کے طور پر ظہور میں آیا - اس کی رو سے شاعر کی شخصیت، اس کا انداز فکر اور اسکی ذھنی ساخت، اس کے کلام پر اس طرح اثر انداز ھوتی ھے کہ جب تک ان نفسیاتی اور جذباتی محرکات کا جو شاعر کو اظہار خیال پر آمادہ کرتے ھیں تجزیہ نہ کیا جائے، شعر کو نہیں سمجھا جا سکتا - ان کے نزدیک اس سے شاعر کی ژرف نگاری، اس کے عمق نظر اور بلندیٔ تخیل کے عناصر کا صحیح اندازہ ھونے کا زیادہ امکان ھوتا ھے -

(پنجم) تشریحی: اس میں نقاد، شاعر کے کلام کی اس طرح تشریح کرتا ھے کہ اس سے اس کی شخصیت، اس کی بنیادی اقدار، اسکے تاثرات کے اجزاء، شعر کی مختلف سطحیں، معانی کے مختلف پہلو، اور تفسیر حیات کے رموز،

قاری کے سامنے واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ تنقیدی زاویہ مغرب و مشرق دونو سمتوں میں زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔

ان مضامین کے انتخاب میں اس بات کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ زمانی ترتیب کے علاوہ مذکورہ بالا زاویہ ہائے تنقید کی نمائندگی بھی ہو جائے۔

یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے مطالعہ سے جو تاثرات ہم نے قائم کیے ہیں، ان کا ذکر کر دیا جائے :

(۱) مرزا کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ ان سے آن کے تجربہ، تاثر اور تفسیر حیات میں ایک خاص قسم کا تنوع پیدا ہو گیا ہے جو اکثر اوقات قاری کو چونکا دیتا ہے۔

(۲) مرزا حُسن کے پرستار ہیں اور اس کی مجازی اور صوری کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ مسرت کی یہ تلاش ان کے ذہن کو روشن کر دیتی ہے، مگر وہ حسنِ ناپائیدار کو دیکھتے دیکھتے حسن ازل کی طرف اس طرح رخ بدل لیتے ہیں کہ ان کے مشاہدات میں بہت سی سطحوں کے ساتھ بےحد عُمق پیدا ہو جاتا ہے۔

(۳) مرزا ایک عقل پرست صوفی ہیں۔ وہ مذہب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کا ایمان بہت پختہ ہے۔ ماسوا سے انہیں کوئی سرو کار نہیں مگر وہ اپنی شخصیت کو فنا کر دینے کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک ایک دیدہ ور انسان ہی انسانِ کامل کہلانے کا حقدار ہے۔

(۴) مرزا رسم و رواج کے قائل نہیں خواہ وہ سماج سے تعلق رکھتے ہوں یا مذہبی امور سے۔ وہ کائنات کے تصور میں تحیر سے گذر کر افہام و تفہیم کی منزل میں قدم رکھنا

اپنا فرض اور حق سمجھتے ہیں اور رموزِ زندگی کو عقدۂ لاینحل نہیں قرار دیتے ۔

(۵) ان کے ہاں جذباتیت ایک پست ذہنی حالت ہے اور وہ کسی جذبہ کو اہم نہیں سمجھتے اور اسے اظہار کے لائق تصور نہیں کرتے جب تک اس کی پشت پر کوئی فکر انگیز خیال نہ ہو ۔ بعض دفعہ ان کا فکر التہابی کیفیت پیدا کرکے اظہار کی معراج تک پہنچ جاتا ہے ۔

(۶) مرزا نے بہت دُکھ جھیلے اور بعض دفعہ انہیں یہ محسوس ہوا کہ غم ہی انسان کا بنیادی تاثر ہے ۔ مگر غم خواہ وہ ذاتی ہو یا انسانی، یا وہ آفاقی حدود پر محیط ہو، ان کی ظرافت آمیز نگاہ کے سامنے شکست کھا جاتا ہے اور ان کے عزم اور استقلال کو مضمحل نہیں کرتا ۔

(۷) مرزا کی تصویر کاری ان کی شاعری میں ایک خاص مقام رکھتی ہے ۔ مرزا کے استعارے، اگرچہ شروع شروع میں نرالے تھے مگر رفتہ رفتہ ان میں رعنائی، ندرت، گونج اور متخیّلانہ خلاقیت پیدا ہوتی گئی اور مرزا نے کئی صنعتوں کو ملا کر تفہیم کے نئے راستے نکال لیے ۔

(۸) مرزا اپنے جذبات اور تجرباتِ حیات نہ صرف ایک دلنشین اور تابندہ انداز میں بیان کرتے ہیں، بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی نظم و نثر میں مغلیہ تہذیب اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے ۔ مگر یہ ایک ایسی تہذیب ہے جو اپنی نفاستیں، اپنا جمالیاتی ذوق اور اپنی فکری تجلّیاں ایک مخصوص طبقے کا حق سمجھتی ہے ۔

ہم ان تمام حضرات کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنے مضامین کلی یا جزوی طور پر اس انتخاب میں شامل کرنے کی ہمیں اجازت دی ۔ آخر میں ایک خوشگوار فرض کا ادا کرنا ضروری ہے ۔ اس کتاب کی تدوین و طباعت میں ڈاکٹر عبدالغنی اور مسٹر عبدالرحمٰن ملک نے ہماری مدد کی ۔ ہم ان کے شکر گذار ہیں۔

سیّد فیّاض محمود

مرزا غالب

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے
محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ‌دار
جس طرح ندّی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ‌وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں
نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریّا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں!
آہ! اے نظّارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں!

گیسوئے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیٔ پروانہ ہے
اے جہاں آباد ! اے گہوارۂ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

(بانگِ درا)

دیباچۂ اردوئے معلّٰی*

سخنورانِ خرد پیشہ اور خردمندانِ درست اندیشہ خوب جانتے ہیں کہ ہمیشہ سے کلامِ عرب کی شیرینی اور زبانِ عجم کی نمکینی گوش زدِ خاص و عام ہے اور ہر عقیل و فہیم اسی بات پر متفق الکلام ہے، مگر یہ جو زبان اردو نے ہندوستان میں رواج پایا ہے یہ بھی ترکیب کی خوبی اور حسن کی اسلوبی میں اُنہیں زبانوں کے ہم پایہ ہے۔ اگر فصحائے عرب و عجم کماحقّہٗ اس زبان کی ماہیت پر عبور پائیں تو اپنی زبان سے زیادہ اس کی تحسین فرمائیں، ہرچند ابتدائے رواج سے ہر عہد میں کاملانِ عصر اس معشوقۂ خرد فریب کی آراستگی و پیراستگی میں سعیٔ فراوان اور کوششِ بےپایاں کرتے آئے ہیں، مگر بالفعل اس زمانہ میں اس زبان کی خوبی کا یہ مرتبہ پہنچا ہے کہ بیان سے باہر ہو گیا ہے۔ اب یہ بدرِ انور بدرجۂ کمال ہے آگے بیم زوال ہے خصوصاً زبانِ اہلِ دہلی کہ اُردوئے معلّٰی بولنا اُن کا حصّہ ہے۔ ہرچند بعض حضرات کو اس بات کا غُصہ ہے مگر جو صاحب کہ فہمِ سلیم و ذہنِ مستقیم وطبعِ رسا و مزاجِ انصاف آشنا رکھتے ہیں وہ اس امر کو مان جاتے ہیں۔ معوجّ الذہن و کج رائے یوں ہی باتیں بناتے ہیں۔ بھلا دہلی کا اسقدر کیونکر مرتبہ نہ ہو جب اس عدیم النظیر کا یہ شہر مینوچہر مسکن و ماوا ہو جس کی طبع وقّاد نے عقدہائے معنی کو وا کیا ہے جس کے ذہنِ نقّاد نے پست و بلند شاہراہِ سخن کو ہموار و مصفّا کیا ہے۔ فصاحت اگر لعلِ ناب ہے تو وہ اس کی آب و تاب ہے اور بلاغت اگر گوہرِ بےبہا ہے تو وہ اُس کی آبروئے جوہر فزا ہے۔ معنی اگر

*اردوئے معلّٰی (۱۸۶۹ء)

گُل ہے تو وہ اُس کی شمیمِ رُوح‌فزا ہے اور سخن اگر آئینہ ہے تو وہ اس کی صیقلِ جلوہ‌نما ہے ۔ اس کا سینۂ بے کینہ نکاتِ حکمیہ کا گنجینۂ اُس کا قلبِ باصفا اسرارِ علمیہ کا دفینہ، شعر و شاعری کی اس کی ذات نے بڑی رونق بڑھائی ہے ۔ اُردو نے اس کی زبان پر گذر کر عزّت پائی ہے ۔ جس قدر تعریف کہ برمز و ایما ہے یہ جناب نجم‌الدولہ دبیرالملک نواب اسداللہ خانصاحب غالب تخلّص کی ذات بابرکات کی خوبیوں کا ایک ادنٰی کرشمہ ہے ؎

میرا اُستاد کہ ہے جس کا سخن عالمگیر
ہے ظہوری کا ظہور اور نظیری کا نظیر

حضرت کا جو سخن ہے وہ دُرعدن، جو بات ہے از رہ معنی کرامات ہے ۔ یہ نثر کی رنگینی، یہ نظم کی شیرینی، یہ غزل کی فصاحت، یہ قصیدہ کی متانت، یہ لفظوں کی محبوبی، یہ ترکیب کی خوش‌اسلوبی، یہ جدتِ معانی، یہ طلاقتِ لسانی، یہ سلاستِ عبارت، یہ روانیِ مطالب دیکھی نہ سُنی ۔ سطریں ہیں کہ موتی کی لڑیاں ہیں ۔ باتیں ہیں کہ مصری کی ڈلیاں ہیں ۔ نثرنثار پر نظم انجم قربان، حسنِ تقریر پر تحریر شعاع سے نثار کرنے کو آفتاب زر بدامان، گفتار شکر بار کو جادو کہوں، سحر کہوں، حیران ہوں کیا کہوں ۔ لا حول و لا قوة ۔ کیا سودائیوں کی باتیں کرتا ہوں ۔ کیا جادو ہے، کیا سحر کا اثر ہے ۔ گفتار اعجاز طراز کے رشک سے ہندوستان میں نہ جادو ہے نہ سحر ہے، ہاں بابل کے کسی کونے میں چُھپا ہو تو کیا خبر ہے ۔ بھلا اس عبارتِ فصاحت نشان کا کیسا بیان ہو جس کی صفائیِ استعارات کی خجلت سے دُرِ شاہوار پانی پانی، جس کی رنگینیٔ فقرات سے جگر خون لعل رمّانی ۔ نہیں نہیں یہ ستایش کچھ سرمایۂ نازش نہیں ۔ کیا موتی کیا لعل اُن کی وجہ قدر و مقدار یعنی آب و تاب اندک تغیّر میں نایاب ہے اور یہ قیامت تک یکساں ۔ تہیدستانِ سرمایۂ سخن کو فیض رسانِ عبارت متین کی کیفیت دیکھ کر جامی تو کیا فلاطونِ خم‌نشین کے نشے ہرن ہوتے ہیں اور اس کے ادراکِ غوامض میں اپنی عقل و خرد کھوتے ہیں ۔ جہاں ایسے ایسے سرخوشانِ خمستانِ معنی، جرعہ‌خوارِ بادۂ گفتار اور نشۂ حسنِ بیان سے

سرشار ہوں پھر ہم سے نارسیدہ اُس پختگی مطالب کو کیا پائیں، کہاں سے ایسی قوت متخیّلہ لائیں۔ سوائے اس کے کہ یہ راہ باریک دیکھ کر قدم لڑکھڑائیں اور اپنی نافہمی پر عرقِ انفعال میں غوطہ کھائیں۔ مگر افسوس کہ اس جنسِ گراں ارز کا کوئی خریدار نہ ہوا اور اس یوسفِ مصرِ سخندانی کا کوئی طالبِ دیدار نہ ہوا۔ حضرت کا ظہور حضرت اکبر شاہ کے عہد میں ہوتا، شاہ عباس دارائے ایران کے عصر میں ہوتا، نظیری اپنا نظیر دیکھ لیتا، ظہوری کو فنِ شعر میں اپنا حریف غالب نظر آ جاتا۔ خیر اب ہم یوں دل خوش کرتے ہیں کہ اگر حضرت اُس وقت میں زینت بخشِ جہان ہوتے تو ہم کہاں ہوتے۔ یہ ہمارے طالع کی خوبی ہے، یہ ہماری خوش نصیبی کہ ایسے منتخب روزگار کے جمالِ باکمال سے مقتبسِ انوار فیض ہوئے اور شرفِ قدمبوسی سے بہرہ‌اندوز ہوئے۔

جب حضرت کو دیکھ لیا گویا سب سخندانانِ پیشینہ کو دیکھ لیا۔ جب حضرت کا کلام سُن لیا سب کا کلام سُن لیا۔ میں میرے قول کی یہ اُردو کی تحریر ہے کہ سہل الممتنع کیا بلکہ ممتنع النظیر ہے۔ اس اُردو کا نیا انداز ہے کہ جس کے دیکھنے سے روح کو اہتزاز ہے، جو کہ بعد تکمیل ہو جانے کلّیات نظم و نثر فارسی کہ وہ ہر ایک آویزۂ گوش فصاحت و پیرایۂ گلوے بلاغت ہے اور ہندوستان سے ایران تک ہر ایک نکتہ‌سنج کے ورد زبان ہے۔ مدت سے حضرت کو اس طرزِ نو ایجادِ اُردو سے لگاؤ ہے اور خط و کتابت میں اسی کا برتاؤ ہے۔ جب شائقین ہنر دوست نے اس نمک ہندی کا مزہ چکھا، ہر ایک سرمایۂ لذت مائدۂ سخن سمجھ کر طلبگار و خواستگار ہوا۔ اس واسطے منشی جواہر سنگھ صاحب جوہر کہ یہ صاحب اخلاق و مروت میں یکتا اور علم دوست و ہنرآشنا ملازمین و معززین سرکار سے ہیں اور اب پنشن‌دار ہیں علم فارسی کو خوب جانتے ہیں۔ اشعار بھی اُسی زبان میں فرماتے ہیں۔ منشی صاحب کے اشعار قابل دید ہیں۔ جناب مرزا صاحب قبلہ کے شاگرد رشید ہیں۔ چنانچہ جناب مرزا صاحب فرماتے ہیں ؎

در معرکہ تیغیم کہ جوہر داریم

اُن کی طبع والا نے یہ اقتضاء کیا کہ گہرہائے شب افروز سلک تحریر میں منسلک ہو کر زینت بخشِ عروسِ سخن ہوں اور بہ گلہائے پراگندہ جمع ہو کر ایکجا گلدستہ ہوں تا اس کے رواح روح پرور سے دماغ نکتہ سرایان غیرت چمن ہو۔ اس واسطے میر فخرالدین صاحب مہتمم اکمل المطابع دھلی نے سعی بےپایاں اور لالہ بہاری لال صاحب منشی مطبع مذکور نے کوشش فراواں سے اکثر خطوط جمع کئے اور قصد انطباع کیا اور اُردوئے معلّٰی نام رکھا گیا اور خطوں کو دو حصّوں پر منقسم کیا۔ پہلے حصے میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے تا کہ طلبائے مدرسہ فائدہ اُٹھائیں۔ دوسرے حصّہ میں مطالبِ مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی تا کہ سخنوران معنی یاب اُس کے دیکھنے سے مزا پائیں اور منشی صاحب موصوف نے اس ہیچمدان خاکسار یعنی مجروحِ دل افگار سے اُس کا دیباچہ لکھنے کو فرمایا۔ بندہ یہ سن کر حیران ہوا کہ یا ربّ دُرشاہوار کے سامنے خزف ریزوں کا کیا اعتبار اور لعل و زمرّد میں پتّھر کے ٹکڑوں کا کیا وقار، مگر الامرفوق الادب سمجھ کر اور اپنے کو اسی خوانِ نعمت کا زلّہ چین جان کر یہ سطریں لکھیں بقول عرفی۔ سہ

چو ذرّہ گرچہ حقیریم نسبتم این بس
کہ آفتاب بود نقطۂ مقابلِ ما

سیّد محمد صدیق حسین خاں

غالب میرزا اسد اللہ خان دہلوی*

خطاب نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ بہادر۔ شاہجہان آباد کے نامی سخنوروں میں سے ہے۔ قوّتِ فکرِ خداداد کا مالک ہے۔ اشعار کی خوش وضع بنیاد تعمیر کرتا ہے اور دلکش معنی اختراع کرتا ہے۔ بیشۂ سخن پروری کا شیر ہے اور معنی گستری کی ولایت کا فرمانروا۔ نثر و نظم میں طرزِ خاص کا مالک ہے اور دل نشین تراکیب ایجاد کرتا ہے۔ ان کے بہت سے معاصر نثر نویسی اور شعر گوئی میں ان کے کمال کے قائل ہیں، لیکن ان کے بعض اقران ان کے طرز و ادائے کلام پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔ قاطع برہان اور ساطع برہان کے دیکھنے سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جاتی ہے۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نثر و نظم کی اصناف سخن پر ان کی قدرت دوسروں سے بیشتر ہے۔ ان کے دیوان میں قصائد، مثنویات، غزلیات اور رباعیات ہیں، لیکن قصاید میں گریز عمدہ نہیں۔ غزل کی نسبت ان کا قصیدہ بہتر ہوتا ہے۔ ان کے اکثر قصیدے حکّام فرنگ، رؤسا اور اکابر ہندوستان کی تعریف میں ہیں۔ بہادر شاہ پادشاہِ دہلی کے وظیفہ خواروں میں سے ہے۔ شیعہ مذہب تھا جیسا کہ خود کہا ہے؂

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس

ہم اسد اللّٰہم وہم اسد اللّٰہیم

کسی وقت شراب پینے سے باز نہیں رہتے تھے۔ زبانِ فارسی پر بہتر عبور تھا۔ عربی زبان کے الفاظ کو استعمال کرنے سے حتی الامکان گریز

*شمع انجمن (۱۸۷۶ء) (اردو ترجمہ)

کرتے تھے ۔ مہر نیمروز، دستنبو، منشآت اور ان کے علاوہ بھی ان کی فارسی کی تصنیفات ھیں ۔ یہ فقیر جب شاھجہان آباد میں اقامت پذیر تھا دو بار اُن سے ملا ۔ اور اُن کی جادو تاثیر تقریر سنی اور غزلیں ان کی زبانی سنیں ۔ قصیدہ اور غزل بسرعتِ تمام کہہ لیا کرتے تھے اور شعر کہتے وقت اپنی طرز کو ھاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے ۔ گاہ گاہ ریختہ اردو میں بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے۔ ریختہ کا ایک مختصر سا دیوان ہے ۔ دیوانِ فارسی ہر طرف پھیل چکا ہے۔ اس میں ۱۳۲۴ شعر ھیں۔ اور ہر شعر شوخئی تاثیر اور خوبئی تقریر کی وجہ سے آویزۂ گوش دل ہے اور عشّاق کے گلے کا ھار۔ لفظ ''غریب'' سے انکی تاریخ ولادت برآمد ھوتی ہے۔ وفات ۱۲۸۵ھ میں واقع ھوئی۔ کلامِ ظہوری اور عرفی کا اتّباع انہیں بڑا مرغوب ہے۔ اور طالب و حزیں کے سخن سے استفادہ بھی ان کی راہ و رسمِ دیرینہ ہے ۔

سیّد نورالحسن خاں

غالب*

فخرِ عرفی و غیرتِ طالب میرزا نوشہ اسد اللہ خان المخاطب بہ نجم الدولہ دبیرالملک نظام جنگ بہادر۔ افراسیاب کی نسل سے تھے۔ اکبر آباد مولد تھا اور دہلی مسکن۔ لفظ "غریب" تاریخ ولادت ہے۔ وفات ۱۲۸۵ھ میں واقع ہوئی۔ پنج آہنگ، دستنبو، مہر نیمروز اور قاطع برہان ان کی تالیفات میں سے ہیں۔ فارسی زبان میں بھی ایک دیوان رکھتے ہیں۔ ابیات کا مجموعہ ۳۲۰۰ ہے۔ اول اول میرزا بیدل کی روش اختیار کی۔ آخرالامر بڑا پسندیدہ انداز ایجاد کیا۔ اپنے دیوانِ ریختہ میں سے بہت سے اشعار نکال دئے ہیں اور قلیل تعداد میں انتخاب کر لئے ہیں۔ پہلے اسد تخلّص کرتے تھے جو غزلیات کے بعض مقطعوں میں اب بھی موجود ہے۔ پچاس سال ان کی مدّت مشق ہے۔ فارسی گوئی میں ان کا پایہ فحول شعراء سے کم نہیں۔ اور ریختہ کی حالت بھی یہ ہے کہ اگر ان کا کوئی ہم مرتبہ ہے تو لائیں۔ اگر حدیقۂ نظم کے لئے نو بہار ہیں تو عرصۂ نثر میں بھی مردِ کار ہیں۔ جمیع اصناف سخن پر جو قدرت انہیں حاصل ہے بیان سے باہر ہے۔ کیا ہر شخص نہیں جانتا کہ بعض سخنور اپنی توجّہ صرف غزل کی طرف معطوف رکھتے ہیں اور غزل کے بغیر اور کچھ نہیں کہہ سکتے اور بعض کا راس المال تو صرف قصیدہ ہوتا ہے اور قصیدہ کے علاوہ اور کسی صنفِ سخن میں ان کی کوئی چیز قابل توجہ نہیں ہوتی۔ علٰی ہذاالقیاس۔ لیکن غالب ایسا سخنور ہے کہ اگر زمین غزل کو دیکھا جائے تو اسے اس نے آسمان پر پہنچا دیا اور اگر مثنوی کا میدان ہے تو اُس کا

*طور کلیم (۱۸۸۱ء) (اردو ترجمہ)

پامال شدہ - قصیدہ میں وہ عرفی کے ہمپایہ ہیں اور ان کی غزل نظیری کی طرح گرانمایہ ہے اور یہ بات بڑی تعجب انگیز ہے کہ جس وادی میں قدم رکھتے تھے سُرعتِ تمام سے اسے طے کر لیتے تھے - اور اس کے باوجود فروغ مضامین، چستئی ترکیب، شوکتِ الفاظ، رنگینئی معنی، متانتِ بیان اور شستگئی زبان کے اوصاف جو کمتر شعراء کو بالقوّہ میسّر تھے انہیں بالفعل عطا ہوئے تھے - دوسرے شعراء کے سلسلہ میں جو مبالغہ کہا جا سکتا ہے وہ غالب کے معاملہ میں حقیقت ہے - انصاف ہمیشہ بالائے طاعت ہوا کرتا ہے - اگر الفضل للمتقدمین کے مطابق میں اسے اساتذۂ قدیم کا ہمسر نہیں کہتا تو دیوانہ بھی نہیں کہ ان سے اسے پست‌تر کہوں - غالب کمالِ سخنوری کے ساتھ کمالِ سخن فہمی بھی رکھتے تھے اور جیسا کہ چاہتے شعر سے خوب لطف حاصل کرتے تھے - حضرت شیفتہ لکھتے ہیں وہ مضامین شعری کو کماحقہٗ سمجھتے تھے اور شعر کے تمام نکات اور لطائف تک رسائی حاصل کر لیتے تھے اور یہ ایسی فضیلت ہے جو صرف بعض اہلِ سخن کے لئے مخصوص ہے - اگر آپ طبع سخن شناس رکھتے ہیں تو اس نکتے کو بآسانی سمجھ لیں گے کیونکہ خوش فکر بھی کمیاب تو ہوتے ہیں لیکن سخن فہم کمیاب تر ہوتے ہیں۔ وہ شخص کتنا خوش نصیب ہے جو ان دونو نعمتوں سے پوری طرح فیضیاب ہوا ہو!

غالب*

اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ خلف مرزا عبداللہ بیگ خاں عرف مرزا دولھا، قوم ان کی ایبک ہے ۔ اقوام ترک جدّ اعلیٰ ان کے ماوراء النہر سے ہندوستان میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے ۔ جب ریاست مغلیہ برھم ہوئی ملازم مہاراجہ جیسور ہوئے اور بود و باش شہر آگرہ میں اختیار کی۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں ان کے والد ماجد غلام حسین خاں کمیدان متوطن شہر آگرہ کے یہاں منسوب ہوئے اور مرزا نوشہ وہیں پیدا ہوئے اور تا سن شعور وہیں مشغول تحصیل کتب درسیہ عربی و فارسی رہے ۔ ابتدا میں شیخ معظم نامی ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی پھر ایک ایرانی آتش پرست سیاح سے جس کا نام آتش پرستی میں ہُرمُزد اور بعد قبول اسلام عبدالصمد تھا تلمذ ہوا ۔ دو برس وہ اُن کے مکان پر مقیم رہا اور زبان فارسی سکھائی ۔ جب سن تمیز کو پہنچے مرزا الٰہی بخش خاں معروف دھلوی کے یہاں منسوب ہوئے اور شہر دھلی میں توطن اختیار کیا ۔ معلومات ان کی زبان فارسی میں کالشمس فی رابعہ النہار آشکار ہے، نثر و نظم اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے ۔ تالیفات و تصنیفات کے نام یہاں لکھے جاتے ہیں ۔ فارسی میں کلیات جس میں غزلیں ردیف وار ہیں ۔ اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں سب قسم کے اشعار ہیں ۔ قادر نامہ جو خالق باری کی طرز پر موزوں کیا ہے۔ مہر نیمروز اور ماہ نیم ماہ یہ نثر میں دو تاریخیں ہیں ۔ تاریخ اوّل میں شاہ تیمور سے ہمایوں تک حال لکھا ہے اور تاریخ

* انتخاب یادگار (۱۸۷۹ء)

ثانی میں عہد جلال الدین اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ کے عہد تک
احوال ضبط کیا ہے ـ دستنبو جس میں غدر کے واقعات ہیں ـ قاطع برہان
جس میں برہان قاطع کی بعض لغات پر خدشات ہیں ـ پنج آہنگ اس میں
فارسی زبان کی منشآت ہیں ـ اردو میں ایک دیوان اور اردوئے معلّٰی اور
عودِ ہندی ـ ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں ـ الحاصل مرزا صاحب
کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے ـ بات سے بات پیدا
کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے ـ اس سرکار فیض آثار کے نمکخوار
قدیم ہیں ـ جناب غفران مآب نواب محمد یوسف علی خانصاحب بہادر
فردوس مکان طاب ثراہ کو ان سے تلمیذ ہے ـ اس عہد میں بھی وظیفہ خوار
رہے بندگانِ ولی نعمت، ید اللہ ظلال اجلالہم کے عہد دولت میں
بھی جب تک زندہ رہے موردِ پرورش بے شمار رہے ـ چوھتر برس کی عمر
پائی ـ بارہ سو پچاسی ہجری میں ذیعقدہ کی دوسری تاریخ وفات پائی ـ
سلطان نظام الدین حضرت محبوب الٰہی قدس سرہٗ العزیز کی درگاہ میں
دفن ہوئے ـ یہ ان کے کلام کا انتخاب ہے جس کا ہر حرف لا جواب ہے ـ

. . . .

نجم الدولہ دبیر الملک
مرزا اسداللہ خاں غالب*

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اسی کمال کواپنا فخر سمجھتے تھے، لیکن چونکہ تصانیف ان کی اُردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرا و روسائے اکبر آباد میں عُلّو خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں، اسی طرح اُردوے معلّٰی کے مالک ہیں۔ اس لیے واجب ہوا کہ ان کا ذکر اس تذکرے میں ضرور کیا جائے۔ نام اسداللہ تھا۔ پہلے اسد تخلّص کرتے تھے۔ جھجّر میں کوئی فرومایہ سا شخص اسد تخلّص کرتا تھا۔ ایک دن اس کا مقطع کسی نے پڑھا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سُنتے ہی اس تخلّص سے جی بیزار ہو گیا، کیونکہ ان کا ایک یہ بھی قاعدہ تھا کہ عوام النّاس کے ساتھ مشترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ / ۱۸۲۹ء میں اسداللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلّص اختیار کیا، لیکن جن غزلوں میں اسد تخلّص تھا انھیں اسی طرح رہنے دیا۔

خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل ہوا، تو غریب خانہ برباد جنگلوں پہاڑوں میں چلے گئے، مگر جوہر کی کشش نے تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ سپہ گری ہمّت کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگی۔ سینکڑوں برس کے بعد پھر اقبال ادھر جھکا اور تلوار سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلجوقی خاندان کی بنیاد انھیں میں قائم ہوگئی، مگر اقبال کا جھکنا جھونکا ہوا کا ہے، کئی پشتوں کے بعد اس نے پھر رُخ پلٹا اور سمرقند میں جس طرح اور شرفاء تھے،

*آب حیات (۱۸۸۰ء)

اس طرح سلجوقی شہزادوں کو بھی گھروں میں بٹھا دیا۔

مرزا صاحب کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا کہ دھلی میں آئے۔ یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے شاہی دربار میں عزت پائی اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے پہاسو کا ایک پرگنہ سیرحاصل ذات اور رسالے کی تنخواہ میں لیا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف‌الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا، وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ اُن کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنو جا کر نواب آصف‌الدولہ مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز بعد حیدرآباد میں جا کر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں ۳ سو سوار کی جمعیّت سے ملازم رہے۔ کئی برس بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اس وقت مرزا کی پانچ برس کی عمر تھی۔ نصراللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صُوبہ‌دار تھے۔ اُنھوں نے دُرِیتیم کو دامن میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو صُوبہ‌داری کمشنری ہو گئی۔ اُن کے چچا کو سواروں کی بھرتی کا حکم ہوا اور چار سو سوار کے افسر ہوئے۔ سترہ سو روپیہ مہینہ ذات کا اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر سونک سون کے پرگنہ پر حین حیات مقرر ہو گئی۔

مرزا چچا کے سایے میں پرورش پاتے تھے، مگر اتفاق یہ کہ مرگ ناگہانی میں وہ مر گئے۔ رسالہ برطرف ہو گیا، جاگیر ضبط ہو گئی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپے کی جائداد چھوڑی تھی۔ قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ وہ امیرزادہ، جو شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا، اُسے ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے، مگر سب کھیل بن بن کر بگڑ گئے۔ چنانچہ اخیر میں کسی دوست نے انھیں لکھا کہ نظام دکن کے لیے قصیدہ کہہ کر فلاں ذریعے سے بھیجو۔ اس

کے جواب میں آپ فرماتے ہیں۔ ''دو برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ نو برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں ۱۰ ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ انھوں نے نہ دیے، مگر تین ہزار روپیہ سال ان میں سے خاص میری ذات کا حصّہ، ساڑھے سات سو روپیہ سال فقط میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتّہ متفق ہوئے میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہوگئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگاہ مر گئے۔ بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینہ مقرر کیا۔ ان کے ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ اودھ کی سرکار سے بہ‌صلۂ مدح گستری پانچ سو روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیئے، یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں، مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہیٔ سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی، سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع مربی کُش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والیے دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسّط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع جائے گی۔ والیے شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی، ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے۔

غرض کہ نوّاب احمد بخش خاں بہادر کی تقسیم سے مرزائے مرحوم نالاں ہو کر ۱۸۳۰ء میں کلکتّہ گئے اور گورنر جنرل سے ملنا چاہا۔ وہاں دفتر دیکھا گیا۔ اس میں سے ایسا کچھ معلوم ہوا کہ اعزاز خاندانی کے ساتھ ملازمت ہو جائے اور سات پارچہ خلعت تین رقم جیغہ مرصّع مالائے مروارید ریاست دودمانی رعایت سے مقرر ہوا۔

غرض مرزا کلکتّہ سے ناکام پھرے اور ایّام جوانی ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بزرگوں کا سرمایہ تمام کر کے دلّی میں آئے۔ یہاں

اگرچہ گزران کا طریقہ امیرانہ شان سے تھا اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی، مگر اپنے عُلوِ حوصلہ اور بلندنظری کے ھاتھوں سے تنگ رہتے تھے - پھر بھی طبیعت ایسی شگفتہ پائی تھی کہ ان دقتوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ھمیشہ کھیل کر غم غلط کر دیتے تھے - کیا خوب فرمایا ھے:

مے سے غرض نشاط ھے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بےخودی مجھے دن رات چاھیے

جب دلّی تباہ ھوئی تو زیادہ‌تر مصیبت پڑی - ادھر قلعے کی تنخواہ جاتی رھی، اُدھر پنشن بند ھو گئی اور انھیں رامپور جانا پڑا - نواب صاحب سے ۲۰ - ۲۵ برس کا تعارف تھا یعنی ۱۸۵۵ء میں ان کے شاگرد ھوئے تھے اور ناظم تخلّص قرار پایا تھا - وہ گاھے گاھے غزل بھیج دیتے تھے، کبھی روپیہ بھی آتا تھا - اس وقت قلعے کی تنخواہ جاری، سرکاری پنشن کُھلی ھوئی تھی - ان کی عنایت فتوح غیبی گنی جاتی تھی - جب دلّی کی صورت بگڑی تو زندگی کا مدار اس پر ھو گیا - نوّاب صاحب نے ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہیّا کر دیا اور انھیں بڑی تاکید سے بُلایا - یہ گئے تو تعظیم خاندانی کے ساتھ دوستانہ و شاگردانہ بغلگیر ھو کر مُلاقات کی اور جب تک رکھا کمال عزّت کے ساتھ رکھا بلکہ سو روپیہ مہینہ ضیافت کا زیادہ کر دیا - مرزا کو دلّی کے بغیر چین کہاں؟ چند روز کے بعد رخصت ھو کر پھر وھیں چلے آئے - چونکہ سرکاری پنشن بھی جاری ھو گئی تھی، اس لیے چند سال زندگی بسر کی -

آخر عُمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا - کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا - نقشِ تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے - کسی کو کچھ کہنا ھوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا- وہ دیکھ کر جواب دے دیتے تھے - خوراک دو تین برس سے یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو پانچ سات بادام کا شیرہ، ۱۲ بجے آبِ گوشت، شام کو ۴ کباب تلے ھوئے - آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸٦۹ء (۱۲۸۵ھ) میں جہانِ فانی سے انتقال فرمایا اور بندۂ آثم نے تاریخ لکھی - آہ غالب بمرد - مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا اور اکثر

یہی پڑھتے رہتے تھے :

دم واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مرزا صاحب کے حالات اور طبعی عادات

اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہلِ ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے ۔ مگر علوم درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی اور حق پوچھو تو یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ ایک امیرزادے کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اُٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجہ کمال تک پہنچائے ۔ وہ کیسی طبع لایا ہوگا، جس نے اس کے فکر میں بلند پروازی، دماغ میں یہ معنی آفرینی، خیالات میں ایسا انداز، لفظوں میں نئی تراش اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی ۔ جابجا خود ان کا قول ہے اور حقیقت میں لُطف سے خالی نہیں کہ زبان فارسی سے مجھے مناسبت ازلی ہے ۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے ۔ مفتی میر عباس صاحب کو "قاطع برہان" بھیج کر خط لکھا ہے، اس میں فرماتے ہیں دیباچے اور خاتمے میں جو کچھ لکھ آیا ہوں، سب سچ ہے ۔ کلام کی حقیقت کی داد جدا چاہتا ہوں ۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی ۔ علم و ہنر سے عاری ہوں، لیکن ۵۵ برس سے محوِ سخن گزاری ہوں ۔ مبدأ فیاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے ۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے ۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں ۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں ۔

ہرمزد نام ایک پارسی ژند و پاژند کا عالم تھا ۔ اُس نے اسلام اختیار کیا اور عبدالصمد اپنا نام رکھا، ایّام سیاحت میں ہندوستان کی طرف آ نکلا اور مرزا سے بھی ملاقات ہوئی ۔ اگرچہ ان کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی تھی، مگر مناسبت ازلی طبیعت میں تھی، جس نے اُسے کھینچا اور دو برس تک گھر مہمان رکھ کر اکتساب کمال کیا، اس روشن ضمیر کے

فیضانِ صحبت کا انھیں فخر تھا اور حقیقت میں یہ امر فخر کے قابل ہے ۔

میں نے چاہا کہ مرزا صاحب کی تصویر الفاظ و معنی سے کھینچوں، مگر یاد آیا کہ انھوں نے ایک جگہ اسی رنگ و روغن سے اپنی تصویر آپ کھینچی ہے، میں اس سے زیادہ کیا کر لوں گا ۔ اس کی نقل کافی ہے ۔ مگر اوّل اتنا سن لو کہ مرزا حاتم علی مہر تخلص ایک شخص آگرہ میں تھے ۔ مرزا کے اواخر عمر میں اس ہم‌وطن بھائی سے خط و کتابت جاری ہوئی ۔ وہ ایک وجیہہ اور طرحدار جوان تھے ۔ ان کی آن سے دید وادید نہ ہوئی، لیکن کسی زمانے کی ہم‌وطنی، شعر گوئی، ہم‌مذہبی اور اتّحاد خیالات کے تعلّق سے شاید کسی جلسے میں مرزا نے کہا کہ مرزا حاتم علی مہر کو سنتا ہوں کہ طرحدار آدمی ھیں، دیکھنے کو جی چاہتا ہے ۔ انھیں جو یہ خبر پہنچی تو مرزا کو خط لکھا اور اپنا حلیہ بھی لکھا ۔ اب اس کے جواب میں جو مرزا آپ ھی اپنی تصویر کھینچتے ھیں، اسے دیکھنا چاہیے ۔

''بھائی! تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سنا تھا، جس زمانے میں کہ وہ حامد علی خاں کی نوکر تھے اور اس میں مجھ میں بےتکلّفانہ ربط تھا، تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ھوا کرتے تھے ۔ اس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھا دیے ۔ بہرحال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے کا مجھ کو رشک نہ آیا، کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت‌نما ہے ۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا، کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ‌ور لوگ اس کی ستائش کیا کرتے تھے ۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے ۔ ھاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خون جگر کھایا تو اس بات پر کہ (تمھاری) داڑھی خوب گھٹی ہوئی ہے ۔ وہ مزے یاد آ گئے ۔ کیا کہوں، جی پر کیا گزری بقول شیخ علی حزیں ؎

تا دسترسم بود ز دم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

(میرے) جب داڑھی موچھ میں بال سفید آ گئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے ـ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے ـ ناچار (میں نے) مسی بھی چھوڑ دی اور داڑھی بھی، مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں (یعنی دھلی میں) ایک وردی ہے عام ـ ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا، بھٹیارا، جلاھا، کنجڑا، منہ پر داڑھی سر پر بال ـ میں نے جس دن داڑھی رکھی، اسی دن سر منڈایا ـ''
اس فقرے سے معلوم ہوا کہ اپنا انداز سب سے الگ رکھنا چاھتے تھے ـ لباس اکثر ان کا اھل ولایت کا ہوتا تھا ـ سر پر اگرچہ کلاہ یا پاخ نہ تھی، مگر لمبی ٹوپی سیاہ بوستین کی ہوتی تھی اور ایسا ضرور چاھیے تھا، کیونکہ وہ فارسی نویسی کو نہ فقط ذوق بلکہ عشق دلی کے ساتھ نباھتے تھے اور لباس و گفتار کی کچھ خصوصیت نہیں ـ وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت رکھتے تھے، خصوصاً خاندان کے اعزازوں کو ہمیشہ جانکاہ عرق‌ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے، اس اعزاز پرکہ جو ان کے پاس باقی تھا ـ دو دفعہ آسمانی صدمے پہنچے ـ اوّل جب چچا کا انتقال ہوا، دوسرے جب ۱۸۵۷ء میں ناکردہ گناہ بغاوت کے جرم میں پنشن کے ساتھ کرسئ دربار اور خلعت بند ہوا ـ ''اردو معلّی'' میں بیسیوں دوستوں کے نام خط ہیں، کوئی اس کے ماتم سے خالی نہیں ـ ان کے لفظوں سے اس غم میں خون ٹپکتا ہے اور دل پر جو گزرتی ہوگی، وہ تو خدا ہی کو خبر ہے ـ آخر پھر ان کی جگہ اور اپنا حق لیا اور بزرگوں کے نام کو قائم رکھا ـ

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دھلی کالج کا انتظام ازسرنو منظور ہوا ـ ٹامس صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال مغرب کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے، اس وقت سکرٹری تھے ـ وہ مدرسین کے امتحان کے لیے دلّی آئے اور چاھا کہ جس طرح سو روپیہ مہینے کا ایک مدرس عربی ہے، ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو ـ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے، ان میں مرزا کا نام بھی آیا ـ مرزا صاحب حسب الطّلب تشریف لائے ـ صاحب کو اطلاع ہوئی، مگر یہ پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب

دستورِ قدیم صاحب سکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے ـ جبکہ نہ وہ اُدھر سے آئے نہ یہ اِدھر سے گئے اور دیر ہوئی تو صاحب سکرٹری نے جمعدار سے پوچھا ـ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے؟ انھوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکر جاتا، جمعدار نے جا کر پھر عرض کی ـ صاحب باہر آئے اور کہا، جب آپ دربار گورنری میں بہ‌حیثیّت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لیے آئے ہیں، اُس تعظیم کے مستحق نہیں ـ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں، نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں ـ صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں ـ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے ـ صاحب موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلایا ـ اُن سے کتاب پڑھوا کر سنی اور زبانی باتیں کر کے اسّی روپے تنخواہ قرار دی ـ انھوں نے سو روپے سے کم منظور نہ کیے ـ صاحب نے کہا، سو روپے لو تو ہمارے ساتھ چلو ـ اُن کے دل نے نہ مانا کہ دلّی کو ایسا سستا بیچ ڈالیں ـ مرزا کے کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ہمیشہ مرزا کو تنگ رکھا ـ مگر اس تنگ‌دستی میں بھی امارت کے تمغے قائم تھے ـ چنانچہ ”اردو معلّٰی“ کے اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے ـ مرزا تفتہ اپنے شاگرد رشید کو ایک خط میں لکھتے ہیں : سو روپے کی ہنڈی وصول کر لی ـ ۴۲ روپے داروغہ کی معرفت اُٹھے تھے، وہ دیے ـ ۵۰ محل میں بھیج دیے ـ ۲۶ باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لیے ـ کلیان سودا لینے بازار گیا ہے، جلد آ گیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا ـ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے ـ بھائی بری آ بنی ہے ـ انجام اچھّا نظر نہیں آتا ـ قصّہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا ـ

کدار ناتھ آپ کا دیوان تھا ـ اسی عالم میں ماہ بہ ماہ آ کر چھٹا بانٹ دیتا تھا ـ آپ کہیں سفر میں گئے ہیں تو اس کے لیے خطوط میں بار بار احکام بھیجتے ہیں ـ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں، ”ہنڈوی

میں ۱۲ دن کی سعاد تھی - ٦ دن گزر گئے تھے، ٦ دن باقی تھے - مجھ کو صبر کہاں - متی کاٹ کر روپے لے لیے - قرض، متفرق سب ادا ہوا - بہت سبکدوش ہو گیا - آج میرے پاس ۷۴ روپے نقد بکس میں ہیں اور ۴ بوتل شراب کی اور ۳ شیشے گلاب کے توشہ‌خانے میں موجود ہیں، الحمدللہ علی احسانہ" -

ایک اور جگہ اپنی بیماری کا حال کسی کو لکھتے ہیں - محل سرا اگرچہ دیوان خانے کے بہت قریب ہے، پر کیا امکان، جو چل سکوں - صبح کو ۹ بجے کھانا یہیں آ جاتا ہے - پلنگ پر سے کھسک پڑا - ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا - پھر ہاتھ دھوئے، کلّی کی، پلنگ پر جا پڑا - پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے - اٹھا اور حاجتی میں پیشاب کر لیا اور پڑ رہا -

نوّاب الٰہی بخش خاں مرحوم کی صاحبزادی سے مرزا صاحب کی شادی ہوئی اور اس وقت ۱۳ برس کی عمر تھی - باوجودیکہ اوضاع و اطوار آزاد نہ رکھتے تھے، لیکن آخر صاحب خاندان تھے، گھرانے کی لاج پر خیال کر کے بی بی کا پاس خاطر بہت مدّنظر رکھتے تھے - پھر بھی اس قید سے کہ خلاف طبع تھی، جب بہت دق ہوتے تھے تو ہنسی میں ٹال دیتے تھے - چنانچہ دوستوں کی زبانی بعض نقلیں بھی سنیں اور ان کے خطوط سے بھی اکثر جگہ پایا جاتا ہے - ایک قدیمی شاگرد سے ایسے معاملات میں بے تکلفی تھی - اس نے امراؤ سنگھ نام ایک اور شاگرد کی بی بی کے مرنے کا حال مرزا صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں اور اب شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ پھر بچے کون پالے؟ اس شخص کی ایک بی بی پہلے مر چکی تھی اور یہ دوسری بی بی مری تھی - اب حضرت اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں: "امراؤ سنگھ کے حال پر اس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے - اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دوبار بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں

پڑا ہے، نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے، نہ دم ہی نکلتا ہے ۔ اس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟'' جب ان کی بندش کھلی تو ایک اور شخص کو لکھتے ہیں : ''تجھ کو میری جان کی قسم اگر میں تنہا ہوتا تو اس قلیل آمد میں کیسا فارغ البال و خوش‌حال رہتا'' ۔ مرزا صاحب نے فرزندان روحانی یعنی پاک خیالات اور عالی مضامین کا ایک انبوہ بےشمار اپنی نسل میں یادگار چھوڑا، مگر افسوس کہ جس قدر ادھر خوش‌نصیب ہوئے، اسی قدر فرزندان ظاہری کی طرف سے بےنصیب ہوئے، چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں : ''سات بچے ہوئے مگر برس برس دن کے پس و پیش میں سب ملک عدم کو چلے گئے ۔'' ان کی بی بی کے بھانجے الٰہی بخش مرحوم کے نواسے زین‌العابدین خاں تھے ۔ وہ بھی شعر کہا کرتے تھے اور عارف تخلّص کرتے تھے ۔ عارف جوان مر گئے اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑے ۔ بی بی ان بچوں کو بہت چاہتی تھیں، اس لیے مرزا نے انھیں اپنے بچوں کی طرح پالا ۔ بڑھاپے میں انھیں گلے کا ہار کیے پھرتے تھے ۔ جہاں جاتے، وہ پالکی میں ساتھ ہوتے تھے ۔ ان کے آرام کے لیے آپ بےآرام ہوتے تھے، اُن کی فرمائشیں پوری کرتے تھے ۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں جوان مر گئے ۔ نوّاب احمد بخش خاں مرحوم کے رشید فرزند مرزا صاحب کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے ۔ کمال کی دولت ان سے لیتے تھے، دنیا کی ضرورتوں میں انھیں آرام دیتے تھے ۔ چنانچہ نوّاب ضیاالدین خاں صاحب شاگرد ہیں ۔ نواب امین الدین خاں مرحوم والیے لوہارو بھی آداب خُسروانہ کے ساتھ خدمت کرتے تھے ۔ نواب علاؤالدین خاں والیے حال اس وقت ولی‌عہد تھے ۔ بچپن سے شاگرد ہیں ۔ چنانچہ مرزا صاحب نواب علاؤالدّین خاں صاحب کو لکھتے ہیں : ''میاں! بڑی مصیبت میں ہوں ۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں، پاخانہ ڈھے گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں ۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں ہائے دبی ہائے مری ۔ دیوان خانے کا حال محل‌سرا سے بدتر ہے ۔ مرنے سے نہیں ڈرتا ۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں ۔ چھت چھلنی ہے ۔

ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے - مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے - مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمّت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے وہ حویلی جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیرین جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوا دو - برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے - تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں یہ مرّوت کا احسان میرے بایان عمر میں اور بھی سہی - غالب'' -

مرزا کثیرالاحباب تھے - دوستوں سے دوستی کو ایسا نباہتے تھے کہ اپنایت سے زیادہ ان کی دوست‌پرستی خوش‌مزاجی کے ساتھ رفیق ہو کر ہر وقت ایک دائرۂ شرفا اور رئیس‌زادوں کا ان کے گرد دکھاتی تھی - انہی سے غم غلط ہونا تھا اور اسی میں اُن کی زندگی تھی - لطف یہ کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کرتے تھے جو دوستوں سے، ادھر ہونہار جوانوں کا مؤدّب بیٹھنا، ادھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا - ادھر سعادت‌مندوں کا چپ مسکرانا اور بولنا تو حد ادب سے قدم نہ بڑھانا، ادھر پھر بھی شوخیٔ طبع سے باز نہ آنا، ایک عجب کیفیّت رکھتا تھا - بہرحال انہی لطافتوں اور ظرافتوں میں زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا اور ناگوار کو گوار کر کے ہنستے کھیلتے چلے گئے - چنانچہ میر مہدی، میر سرفراز حسین، نواب یوسف مرزا وغیرہ اکثر شریف‌زادوں کے لیے خطوط ''اردوِمعلّی'' میں ہیں، جو کہ ان جلسوں کے فوٹوگراف دکھاتے ہیں -

زمانے کی بےوفائی نے مرزا کو وہ فارغ البالی نصیب نہ کی، جو ان کے خاندان اور کمال کے لیے شایاں تھی اور انہی دو باتوں کا مرزا کو بہت خیال تھا، لیکن اس کے لیے وہ اپنے جی کو جلا کر دل‌تنگ بھی نہ ہوتے

تھے، بلکہ ھنسی میں اُڑا دیتے تھے ۔ ان دونوں باتوں کی سند میں دو خط نقل کرتا ھوں ۔ ایک خط میر مہدی صاحب کے نام ہے کہ ایک شریف عالی خاندان ھیں اوزان کے رشید شاگرد ھیں ۔ دوسرا خط منشی ھرگوپال صاحب تفتہ تخلّص کے نام ہے، جن کا ذکر مجملاً پہلے لکھا گیا ہے ۔

”میر مہدی! تم میری عادات کو بھول گئے؟ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ھوئی ہے؟ میں اس مہنیے میں رامپور کیونکر رھتا؟ نوّاب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے ۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے، مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا ۔ یک شنبہ کو غرۂ ماہ مقدّس ھوا ۔ اسی دن سے ھر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سُنتا ھوں ۔ شب کو جامع مسجد میں جا کر تراویح پڑھتا ھوں، کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ھوں اور سرد پانی پیتا ھوں ۔ . . .

” . . . واہ واہ! کیا اچھی عمر بسر ھوتی ہے اب اصل حقیقت سُنو ۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا ۔ وھاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ۔ تنہا بھیج دینے میں وھم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ھو تو بدنامی عمر بھر رہے ۔ اس سبب سے جلد چلا آیا ۔ ورنہ گرمی برسات وھیں کاٹتا ۔ اب شرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا ۔ قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینہ ہے، سو روپیہ مجھے ماھوار بھیجتے تھے، اب میں جو وھاں گیا تو سو روپیہ مہینہ بنام دعوت اور دیا ۔ یعنی رامپور رھوں تو دو سو روپیہ پاؤں اور دلی رھوں تو سو روپے ۔ بھائی! سو دو سو میں کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ نوّاب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ھیں ۔ مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ھیں ۔ ملاقات بھی دوستانہ رھی ۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے، وہ صورت ملاقات کی ہے ۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی ۔ پس بہرحال غنیمت

ہے ۔ . . . رزق کے اچھی طرح ملنے کا شُکر چاہیے، کمی کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھہرے ۔ اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپیہ سال ۔ ایک صاحب نے نہ دیے، مگر تین ہزار روپیہ سال ۔ عزّت میں وہ پایہ، جو رئیس‌زادوں کے واسطے ہوتا ہے، بنا رہا ۔ خاں صاحب بسیار مہربان دوستان القاب، خلعت سات پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالاے مروارید ۔ بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے ۔ بخشی، ناظر، حکیم، کسی سے توقیر کم نہیں، مگر فائدہ وہی قلیل ۔ سو میری جان! یہاں بھی وہی نقشہ ہے ۔ کوٹھڑی میں بیٹھا ہوں ۔ ٹٹّی لگی ہوئی ہے ۔ ہوا آ رہی ہے ۔ پانی کا جھجّر دھرا ہوا ہے، حقّہ پی رہا ہوں ۔ یہ خط لکھ رہا ہوں، تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کر لیں ۔''

خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ : ''بس اب تم سکندرآباد میں رہے ۔ کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا روپیہ اُٹھا چکے ہو، اب کہاں سے کھاؤ گے ۔ میاں! نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے ۔ ایک چرخ ہے کہ چلا جاتا ہے ۔ جو ہونا ہے، وُہ ہوا جاتا ہے ۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے ۔ کہنے کی بات ہو تو کہا جائے ۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے :

رغبت جاہ چہ و نفرت اسباب کدام
زیں ہوسہا بگزر یا نگزر، میگزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں، نہ مقیّد ۔ نہ رنجور ہوں، نہ تندرست ۔ نہ خوش ہوں، نہ نا خوش، نہ مردہ ہوں، نہ زندہ ۔ جیئے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں ۔ روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ بگاہ پیئے جاتا ہوں ۔ جب موت آئے گی، مر بھی رہوں گا ۔ نہ شُکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے ۔''

مرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سنّت و الجماعت

تھا، مگر اہل راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ اُن کا مذہب شیعہ تھا اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوش محبّت میں تھا، نہ کہ تبرّا اور تکرار میں ۔ چنانچہ اکثر لوگ انہیں نصیری کہتے تھے اور وہ سُن کر خوش ہوتے تھے ۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں :

منصور فرقۂ علی اللّٰہیاں منم
آوازۂ انا اسداللہ بر افگنم

تمام اقربا اور حقیقی دوست سنّت و الجماعت تھے، لیکن ان کی اپنایت میں کسی طرح کی دوئی نہ معلوم ہوتی تھی ۔ مولٰنا فخر الدّین کے خاندان کے مرید بھی تھے ۔ دربار اور اہلِ دربار میں کبھی اس معاملے کو نہیں کھولتے تھے اور یہ طریقہ دھلی کے اکثر خاندانوں کا تھا ۔ تصنیفات اردو میں ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتّب ہو کر چھپا ۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں اور کچھ متفرّق اشعار ہیں ۔ غزلوں کے تخمیناً ۱۵۰۰ شعر، قصیدوں کے ۱۶۲ شعر، مثنوی کے ۳۳ شعر، متفرّقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر، رُباعیاں ۱۶، دو تاریخیں جن کے ۴ شعر ۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے، اس سے ہزاروں درجہ عالم معنی میں کلام بلند ہے، بلکہ اکثر شعر ایسے اعلٰی درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے ۔ جب ان شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے تو اُس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیم سُخن کا بھی بادشاہ تھا، اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا :

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک اور رُباعی بھی کہی :

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مشکل وگرنہ گویم مُشکل

ایک دن استاد مرحوم سے مرزا صاحب کے انداز نازک خیالی کا اور فارسی ترکیبوں کا اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا۔ میں نے کہا بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے۔ فرمایا خوب! پھر کہا کہ جو مرزا کا شعر ہوتا ہے، اس کی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ شعر اُن کے میں تمھیں سناتا ہوں۔ کئی متفرق شعر پڑھے تھے، ایک اب تک خیال میں ہے:

دریاے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشے کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیّت رکھتی ہیں۔ اوّل، کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی اُن کا شیوہ خاص تھا، دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے اُنھیں طبعی تعلّق تھا، اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے نہیں، لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں، وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔ اہلِ ظرافت بھی اپنی نوک جھونک سے چوکتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا بھی مشاعرے میں تشریف لے گئے۔ حکیم آغا جان عیشؔ ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے۔ غزل طرحی میں یہ قطعہ پڑھا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی واسطے اواخر عمر میں نازک خیالی کے طریقے کو بالکل ترکہ

کر دیا تھا ۔ چنانچہ دیکھو اخیر کی غزلیں صاف صاف ہیں ۔ دونوں کی کیفیت جو کچھ ہے، معلوم ہو جائے گی ۔ سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں ان کا دیوان بہت بڑا تھا، یہ منتخب ہے ۔ مولوی فضل حق صاحب فاضل بے عدیل تھے ۔ ایک زمانے میں دھلی کی عدالتِ ضلعی میں سررشتہ دار تھے ۔ اُسی عہد میں مرزا خان عرف مرزا خانی صاحب کوتوالِ شہر تھے ۔ وہ مرزا قتیل صاحب کے شاگرد تھے ۔ نظم و نثر فارسی اچھی لکھتے تھے ۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے ۔ ہمیشہ باھم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے ۔ انھوں نے اکثر غزلوں کو سُنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ شعر عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے ۔ مرزا نے کہا ! اتنا کچھ کہہ چکا، اب تدارک کیا ہو سکتا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا، انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو ۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا ۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا ۔ وہ یہی دیوان ہے، جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں ۔

عودِ ہندی : کچھ تقریظیں کچھ اور نثریں اور خطوط ہیں ۔ اکثر خطوط میں ان لوگوں کے جواب ہیں ، جنھوں نے کسی مشکل شعر کے معنی پوچھے یا کوئی امر تحقیق طلب یا فارسی یا اردو کا دریافت کیا ۔

اُردوے معلّٰی (۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء) : چند شاگردوں اور دوستوں نے جس قدر اردو کے خطوط اُن کے ھاتھ آئے، ایک جگہ ترتیب دیئے اور اُس مجموعے کا نام مرزا نے خود اردوے معلّٰی رکھا ۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے، گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں، مگر کیا کریں کہ ان کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصّع ہوتی تھیں ۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں، یہ علم کی کم رواجی کا

سبب ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں : ''کیا جگر خون کُن اتّفاق ہے ۔ اب درنگ ورزی کی تقصیر معاف کیجئے ۔ پس چاہیے کوئل کی آرائش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا یہ رتبہ میری اورش کے فوق ہے ۔ سرمایۂ نازش قلمرو ہندوستان ہو ۔'' بعض جگہ خاص محاورہ فارسی کا ترجمہ کیا ہے، جیسے میر اور سودا وغیرہ استادوں کے کلام میں لکھا گیا ہے ۔ چنانچہ انہی خطوں میں فرماتے ہیں : ''اس قدر عذر چاہتے ہو'' ۔ یہ لفظ ان کے قلم سے اس واسطے نکلا کہ عذر خواستن جو فارسی کا محاورہ ہے، وہ اس باکمال کی زبان پر چڑھا ہوا ہے ۔ ہندوستانی عذر کرنا یا عذر معذرت کرنی بولتے ہیں ۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھے اُس شخص سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں ۔ یہ بھی ترجمہ نظریریں ضابطہ کا ہے ۔ ''منشی نبی بخش تمھارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہیں ۔'' گلہ ها دارند و شکوہ ها دارند فارسی کا محاورہ ہے ۔ ''کیوں مہاراج کول میں آنا، منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا !'' یاد آوردن خاص ایران کا سکہ ہے، ہندوستانی یاد کرنا بولتے ہیں ۔ ''جو آپ پر معلوم ہے، وہ مجھ پر مجہول نہ رہے ۔'' ہر چہ بر شما منکشف است، برمن مخفی نماند ۔

ان خطوں کی طرز عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں ۔ یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اوروں کو لطف دے گئے، دوسرے کا کام نہیں ۔ اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں ۔ اس کتاب میں چونکہ اصلی خط لکھے ہیں، اس لیے وہ ان کی ظاہری و باطن کی حالت کا آئینہ ہیں ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے غم و الم ہمیشہ انہیں ستاتے تھے اور وہ علّو حوصلہ سے ہنسی ہی میں اڑاتے تھے ۔ پورا لطف ان

تحریروں کا اس شخص کو آتا ہے کہ جو خود ان کے حال سے اور مکتب الٰہیوں کی چال ڈھال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو، غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں، اس لیے اگر ناواقف اور نے خبر لوگوں کو اس میں مزہ نہ آئے تو کچھ تعجب نہیں۔

اس کتاب میں قلم، التماس کو مونث، پنشن، بیداد، بارک کو مذکر فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں : ”میرا اردو بہ نسبت اوروں کے فصیح ہوگا۔“

لطائف غیبی: اس رسالے میں منشی سعادت علی کی طرف روے سخن ہے۔ اگرچہ اس کے دیباچے میں سیف الحق لکھا ہے، مگر انداز عبارت اور عبارت کے چٹکلے صاف کہتے ہیں کہ مرزا ہیں۔ وہ درحقیقت وہی میاں داد خاں ہیں، جن کے نام چند رقعے مرزا صاحب کے ”اردوئے معلّٰی“ میں ہیں۔ چنانچہ ایک رقعے میں انہیں فرماتے ہیں کہ صاحب میں نے تم کو سیف الحق خطاب دیا۔ تم میری فوج کے سپہسالار ہو۔

تیغ تیز: مولوی احمد علی پروفیسر مدرسۂ ہگلی نے قاطع برہان کے جواب میں مؤیدالبرہان لکھی تھی۔ اس کے بعض مراتب کا جواب مرزا صاحب نے تحریر فرما کر تیغ تیز نام رکھا۔

ساطع برہان کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں، وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں۔

تصنیفات فارسی

فارسی کی تصنیفات کی حقیقت حال کا لکھنا اور ان پر رائے لکھنی اردو کے تذکرہ نویس کا کام نہیں ہے، اس لیے فقط فہرست لکھتا ہوں۔

قصائد : حمد و نعت میں، آئمہ معصومین کی مدح میں، بادشاہ دہلی، شاہ اور گورنروں اور بعض صاحبانِ عالیشان کی تعریف میں ہیں۔

غزلوں کا دیوان : مع دیوان قصائد کے ۱۸۳۳-۱۸۳۵ءمیں مرتب ہو کر نقلوں کے ذریعے سے اہلِ ذوق میں پھیلا اور اب تک کئی دفعہ چھپ چکا ہے -

پنج آہنگ : اس میں پانچ آہنگ کے پانچ باب فارسی کے انشاء پردازوں کے لیے جو کہ ان کے انداز میں لکھنا چاہیں، ایک عمدہ تصنیف ہے -

۱۸۶۳ء میں قاطع برہان چھپی - بعد کچھ تبدیلی کے اسی کو پھر چھپوایا اور درفش کاویانی نام رکھا - برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں، مگر اس پر فارسی کے دعویداروں نے سخت حملوں کے ساتھ مخالفت کی -

نامۂ غالب : قاطع برہان کے کئی شخصوں نے جواب لکھے - چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبدالرحیم نام ایک معلّم نابینا تھے، انھوں نے اس کا جواب ساطع برہان لکھا - مرزا صاحب نے خط کے عنوان میں حافظ صاحب موصوف کو بطور جواب کے چند ورق لکھے اور ان کا نام نامۂ غالب رکھا -

مہر نیمروز : حکیم احسن اللہ خان طبیب خاص بادشاہ کے تھے - انہیں تاریخ کا شوق تھا اور اہلِ کمال کے ساتھ عموماً تعلّق خاطر رکھتے تھے - مرزا ان کے ایما سے اوّل کتاب مذکور کا ایک حصّہ لکھا - اسی کے ذریعے سے ۱۸۵۰ء میں باریاب حضور ہو کر خدمت تاریخ نویسی پر مامور ہوے اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب بہادر نظام جنگ خطاب ہوا - چنانچہ پہلی جلد میں امیر تیمور سے ہمایوں تک کا حال بیان کر کے مہر نیمروز نام رکھا - ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ نام رکھیں کہ غدر ہو گیا -

دستنبو : ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حالِ بغاوت، روداد تباہیٔ شہر، اپنی سرگزشت، غرض کل ۱۵ مہینے کا حال لکھا ہے -

سبد چین : دو تین قصیدے ،چند قطعے، چند خطوط فارسی کے اس میں ہیں کہ دیوان میں درج نہ ہوئے تھے۔

اواخر عمر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اردو کی تصنیفات نوّاب حسین مرزا صاحب کے پاس رہتی تھیں اور ترتیب کرتے جاتے تھے۔ فارسی نواب ضیاؤالدین احمد خاں صاحب کو بھیج دیتے تھے کہ انھیں نیر رخشاں تخلّص کر کے اپنا رشید شاگرد اور خلیفۂ اوّل قرار دیا تھا۔ خلیفۂ دوم نوّاب علاؤالدین خاں صاحب تھے۔

ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی انشاء پردازی کے شوق کو بڑی کاوش اور عرق ریزی سے نباہتے تھے۔ اسی واسطے مرنے سے ۱۰، ۱۵ برس پہلے اُن کی تحریریں اردو میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک دوست کے خط میں خود فرماتے ہیں :

''بندہ نواز! زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ :

مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

''کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں، سب دوستوں کو، جن سے کتابت رہتی ہے، اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے، ان میں سے الی الآن موجود ہیں۔ ان سے بھی عندالضّرورت اسی زبان مروّج میں مکاتبت و مراسلت کا اتّفاق ہوا کرتا ہے۔''

سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی

غالب علیہ الرحمۃ*

یہ وہ خوش مذاق شخص گزرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا ۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولائتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پر ہوا ۔ اول امیر خسرو، دوم حسن دہلوی، سوم مرزا بیدل، چہارم غالب ۔ اگرچہ ناصر علی سہرندی اور مرزا جانجاناں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خان آرزو اور آزاد بلگرامی اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد یہ سب کے سب خوشگوار اور شاعر بے بدل تھے مگر جادۂ ایجاد خداداد ہے انہیں چاروں کی راست قامت پر راست آیا اور ان چاروں کے سوا جنکے نام نامی لکھے گئے ہیں انپر بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا ۔ گو ان کے سوا اور بھی شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے ہیں مگر ان لوگوں کی خوبیوں کو نہیں پاتے اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے ۔ یہ تو خدا کی دین ہے ۔

اہلِ مذاق با انصاف میرے اس لکھنے کا بُرا نہ مانیں ۔ میرا خاندان سلسلہ وار صاحب علم و شعر گزرا ہے اور بلگرام کے فضلاء میں علامہ عبدالجلیل بلگرامی بھی شعرائے فارسی میں سے تھے جو نعمت خان عالی کے ہمعصر اور ہم طرح وقائع میں تھے ۔ ان کو میں نے شمار نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ اور پایہ رکھتے تھے ۔ غرض میرے نزدیک آغاز امیر خسرو سے ہوا اور انجام غالب دہلوی پر ہوا ۔ ہندوستان کی فارسی شاعری کا کہ شمس‌الدین فقیر دہلوی کے وقت سے

* تذکرۂ جلوۂ خضر (۱۸۸۴ء)

ایک طرز خاص سلاست آمیز شروع ہوا تھا، رنگ ہی بدل دیا اور بڑی ہمت کرکے فارسی کو پھر ولایت کی کرسی پر بٹھایا ۔ انکے کلام سے ظاہر ہے ۔

اردو نظم بھی ایک طور خاص کی کہی ۔ اسمیں بھی ایجاد خاص ہے ۔ آخر میر تقی کا رنگ بالکل اتار لیا ۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پر توجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عادت سے اسکو بلند کر دیا یعنی نہ ناسخ کی طرز رہی نہ دھلی کی ۔ دقت پسندی کے ساتھ ترکیب و بندشِ فارسی زیادہ کر دی یہاں تک کہ سوائے فعل کے کوئی لفظ ھندی اکثر شعروں میں نہیں آیا ۔ مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل‌پسند آیا

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس میں آیا کی جگہ آمد اور مانگے کی جگہ طلبد بنادو تو فارسی کا مطلع اور شعر ہے ۔ اسی پر حضرت نے فرمایا ہے ؎

جو کہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اوسے سنا کہ یوں

مگر جب دقیقہ سنجوں نے حضرت کے اشعار کو بے معنی کہنا شروع کیا تو حضرت نے فرمایا ؎

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ھیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس پر بھی لوگوں نے اکتفا نہ کی اور زبانی حضرت سے کہا کہ آپ مشکل پسندی کو چھوڑ دیجیے ۔ چنانچہ اس کا ذکر جناب آزاد نے

آبِ حیات میں کیا ہے ۔ اسوقت حضرت نے یہ رباعی کہی ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اوسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

آخر اپنے دیوان کو منتخب فرمایا اور کوئی بیس جزو کا چار جزو پر دار و مدار رکھا ۔ اور یہ شعر فرما دیا ؎

کُھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یعنی حضرت کا مذاقِ خاص اسی انتخاب سے معلوم ہو گیا ۔

واقعی انتخاب وہ کیا کہ اب اس سے زیادہ انتخاب نہیں ہو سکتا، اور اس انتخاب کے بعد سے میر تقی میر کے طرز کو اختیار کیا، اور آغاز اس کا اس شعر سے کیا ؎

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اس پر ذوق نے طعن سے کہا بھی ؎

نہوا پر نہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مگر حقیقت میں میر کا انداز جو کچھ برتا تو غالب ہی نے برتا ۔ اگرچہ میر تقی کے زبان کی مناسبت تو نہیں ہے کیونکہ ان کے وقت میں زبان بہت کچھ صاف ہو چکی تھی، مگر بندش اور الفاظ کی چستی اور درستی بالکل میر کی ہے، مگر کبھی میر سے انحراف نہ کیا ۔ شوخئی طبع سے اگر کہا بھی تو یوں کہا ؎

ریختہ کے تمہیں اُستاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذوق کو ان سے کچھ مناسبت نہیں تھی۔ چنانچہ فارسی کے دیوان میں قطعات حضرت غالب کے اسی غیر مناسبت کی دلیل ہیں اور جناب آزاد نے بھی آبِ حیات میں اس کا اشارہ کیا ہے۔

اردو نثر میں پوری واقعہ نگاری کا ایجاد انہیں کا ہے، ورنہ اس سے پہلے مرصّع اور مسجّع غیر واقع نثر لکھی جاتی تھی۔ اردوئے معلّٰے انہیں جواہر بھرے خطوط کا مخزن ہے جس میں اس نئی ایجاد کا رنگ ہے۔

الطاف حسین حالی

مرزا کے کلام پر ریویو*

تمہید

مرزا کے کلام پر ریویو کرنا اور اُس کی حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی، ایک ایسے زمانے میں جب کہ فارسی زبان ہندوستان میں بمنزلہ مردہ زبان کے ہو گئی ہے اور ذوق شعر روز بروز کافور ہوتا جاتا ہے، ایک نہایت مشکل کام ہے۔ مرزا کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ گراں قدر ہے، وہ اُن کی فارسی نظم و نثر ہے، لیکن اول تو فارسی زبان سے ملک میں عام اجنبیت پائی جاتی ہے، دوسرے مرزا کے کلام میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے لوگوں کے مذاق بالکل نا آشنا ہیں۔ پس جو شخص اس زمانے میں اُن کے کلام پر ریویو کرنا اور اُس کے ذریعے سے مصنف کی حقیقت اور اُس کا رتبہ ظاہر کرنا چاہتا ہے، وہ درحقیقت ایک ایسے کام کے درپے ہے جس میں کامیابی کی بہت ہی کم اُمید ہو سکتی ہے، لیکن اگر کچھ امید ہے تو اُسی صورت میں ہے کہ کچھ کیا جائے، نہ یہ کہ کام کی مشکلات پر نظر کر کے اس سے ہاتھ اٹھا لیا جائے ؎

دفع غم نیست جز بغم خوردن
چارۂ کار نیست جز کردن

مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی، بلکہ ان کی حالت پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اُن کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ اُنھوں نے، جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی

* یادگار غالب (۱۸۹۷ء)

ہے، گیارہ برس کی عمر۱ میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اُسی زمانے میں اُنھوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کیے تھے جن کی ردیف میں ''کہ چہ'' بجائے ''یعنی چہ'' کے استعمال کیا تھا۔ جب اُنھوں نے وہ اشعار اپنے استاد شیخ معظم کو سنائے تو اُنھوں نے کہا کہ ''یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے؟ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔'' مرزا یہ سن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر اُن کی نظر پڑ گیا جس کے آخر میں لفظ ''کہ چہ'' ''یعنی چہ'' کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے استاد کے پاس گئے اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اُس کو دیکھ کر حیران ہو گئے اور مرزا سے کہا تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے، تم ضرور فکرِ شعر کیا کرو اور کسی کے اعتراض کی کچھ پروا نہ کرو . . .

دیوان ریختہ

مرزا نے گلِ رعنا۲ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے اول اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا، اس لیے ہم بھی پہلے اُن کے اردو

۱ - منشی بہاری لال مشتاق کا بیان ہے کہ لالہ کنھیالال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عمر تھے، ایک بار دلی میں آئے اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثناء کلام میں ان کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی، وہ بھی آپ کو یاد ہے؟ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اردو مثنوی میرے پاس موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لا کر دی اور وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اس کے آخر میں یہ فارسی شعر کسی اُستاد کا پتنگ کی زبان سے لاحق کر دیا تھا۔

''رشتۂ در گردنم افگندہ دوست می کشد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست''

لالہ صاحب کا بیان تھا کہ مرزا صاحب کی عمر جب کہ یہ مثنوی لکھی تھی، آٹھ نو برس کی تھی۔

۲ - مرزا نے اپنے کلکتے کے ایک دوست مولوی سراج احمد کی فرمائش سے اپنے تمام اردو فارسی دیوان کا انتخاب کیا تھا جس کا دیباچہ اُن کے کلیات نثر فارسی میں موجود ہے، اس کا نام 'گلِ رعنا' رکھا تھا۔

دیوان کا ذکر کرتے ھیں - جس روش پر مرزا نے ابتدا میں اُردو شعر کہنا شروع کیا تھا، قطع نظر اس کے کہ اُس زمانے کا کلام خود ھمارے پاس موجود ھے، اُس روش کا اندازہ اس حکایت سے بخوبی ھوتا ھے - خود مرزا کی زبانی سنا گیا ھے کہ میر تقی ۳ نے جو مرزا کے ھم وطن تھے اُن کے لڑکپن کے اشعار سن کر یہ کہا تھا کہ ''اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا اور اُس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا -''

مرزا کے ابتدائی اشعار دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ کچھ تو طبیعت کی مناسبت سے اور زیادہ تر ملا عبدالصمد کی تعلیم کے سبب فارسیت کا رنگ ابتدا ھی میں مرزا کے بول چال اور اُن کی قوت متخیلہ پر چڑھ گیا تھا - یہ بھی معلوم ھوتا ھے کہ جس طرح اکثر ذکی الطبع لڑکے ابتداء میں سیدھے سادے اشعار کی نسبت مشکل اور پیچیدہ اشعار کو جو بغیر غور و فکر کے آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے، زیادہ شوق سے دیکھتے اور پڑھتے ھیں، مرزا نے لڑکپن میں بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا، چنانچہ جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی اُسی روش پر مرزا نے اُردو میں چلنا اختیار کیا تھا، جیسا کہ وہ خود فرماتے ھیں :

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا
اسد اللہ خاں قیامت ھے

۳ - مرزا کی ولات ۱۲۱۲ھ میں ھوئی ھے اور میر کی وفات ۱۲۲۵ھ میں واقع ھوئی - اس سے ظاھر ھے کہ مرزا کی عمر میر کی وفات کے وقت تیرہ چودہ برس کی تھی؛ مرزا کے اشعار ان کے بچپن کے دوست نواب حسام الدین حیدر خاں مرحوم والد ناظر حسین مرزا صاحب نے میرتقی کو دکھائے تھے -

جناب مولانا غلام رسول مہر کو اس کی صحت سے اتفاق نہیں ھے (ماہ نو، فروری ۱۹۴۹ء) لیکن مالک رام صاحب (ذکر غالب، طبع سوم، صفحہ ۴۲) نے اس کے امکان پر ایک اطمینان بخش بحث کی ھے -

یہاں بطور نمونے کے مرزا کے ابتدائی کلام میں سے چند اشعار لکھے جاتے ہیں:

(۱) کرے ٭ گر فکر تعمیر خرابی ہائے دل گردوں
نہ نکلے خشت مثل استخواں بیروں ز قالب ہا

(۲) اسد ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن
بہ بند گریہ ہے نقش بر آب امید رستن ہا

(۳) بہ حسرت گاہ ناز کشتۂ جان بخشیٔ خوباں
خضر کو چشمۂ آب بقا سے ترجبیں پایا

(۴) رکھا غفلت نے دور افتادۂ ذوق فنا ورنہ
اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

(۵) بریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبۂ بالش.
خیال شوخیٔ خوباں کو راحت آفریں پایا

(۶) موسم گل میں مے گلگوں حلال مے کشاں
عقد وصل دخت رز انگور کا ہر دانہ تھا

(۷) ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا
گوئیا صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

چونکہ مذکورہ بالا شعروں میں قطع نظر اس کے کہ طرز بیان اُردو بول چال کے خلاف ہے، خیالات میں بھی کوئی لطافت نہیں معلوم ہوتی، اس لئے ان کے معنی بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، صرف چوتھے

٭ - یہ شعر مرزا نے اپنے دیوان ریختہ میں سے تو نکال ڈالا مگر دیوان فارسی میں بتغیر الفاظ داخل کر دیا یعنی اس طرح :

کند گر فکر تعمیر خرابیہائی ما گر دوں
نیاید خشت مثل استخوان بیرون ز قالب ها

شعر کی جو کسی قدر آسان ہے، یہاں بطور نمونہ کے شرح کی جاتی ہے، تاکہ معلوم ہو کہ مرزا نے مشق سخن کس قسم کے خیالات سے شروع کی تھی اور کس قدر کاوش سے وہ یہ نئی قسم کے مضمون پیدا کرتے تھے۔

کہتا ہے کہ فنا میں جو لذت اور ذوق تھا ہماری غفلت نے اُس سے ہمیشہ دور دور رکھا۔ اگر یہ غفلت نہ ہوتی تو اشارت فہم کے لئے ہر ایک ناخن جو کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے، ابرو کا کام دیتا تھا۔ ابرو کا کام ہے اشارہ و ایماء کرنا اور ناخن بریدہ جو ابرو کی شکل ہوتا ہے، وہ بھی فنا کی لذت کی طرف اشارہ کرتا تھا، کیوں کہ ناخن کے کٹنے سے جو ایک قسم کی فنا ہے، لذت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

یہ اوپر کی سات بیتیں ہم نے مرزا کے ان نظری اشعار اور نظری غزلوں میں سے نقل کی ہیں جو اُنھوں نے اپنے دیوان ریختہ کو انتخاب کرتے وقت اُس میں سے نکال ڈالی تھیں، مگر اب بھی اُن کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب بہت سے اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن پر اُردو زبان کا اطلاق مشکل سے ہو سکتا ہے، جیسے ذیل کے اشعار جو اب دیوان میں موجود ہیں:

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بہ خوں غلطیدن بسمل پسند آیا
لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بہ صد رنگ گلستاں ہونا
شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ، صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ان اشعار کو مہمل کہو یا بے معنی، مگر اس میں شک نہیں کہ

مرزا نے وہ نہایت جاں کاہی اور جگر کاوی سے سر انجام کیے ہوں گے۔ جب کہ اپنے معمولی اشعار کاٹتے ہوئے لوگوں کا دل دکھتا ہے تو مرزا کا دل اپنے اشعار نظری کرتے ہوئے کیوں نہ دکھا ہوگا؟ ظاہرا یہی سبب تھا کہ انتخاب کے وقت بہت سے اشعار جو فی‌الواقع نظری کرنے کے قابل تھے ان کے کاٹنے پر مرزا کا قلم نہ اٹھ سکا۔ ممکن ہے کہ ایک مدت کے بعد یہ اشعار ان کی نظر میں کھٹکے ہوں، مگر چونکہ دیوان چھپ کر شائع ہو چکا تھا، اس لیے اُنھوں نے ان اشعار کا نکالنا فضول سمجھا۔

مرزا کے حق میں جو پیش گوئی میر تقی نے کی تھی اس کی دونوں شقیں ان کے حق میں پوری ہوئیں۔ ظاہر ہے کہ مرزا اول اول ایسے رستے پر پڑ لیے تھے کہ اگر استقامت طبع اور سلامت ذہن اور بعض صحیح المذاق دوستوں کی روک ٹوک اور نکتہ چیں ہم عصروں کی خردہ گیری اور طعن و طعریض سدِّ راہ نہ ہوتی تو وہ شدہ شدہ منزل مقصود سے بہت دور جا پڑتے۔ سنا گیا ہے کہ اهل دهلی مشاعروں میں، جہاں مرزا بھی ہوتے تھے، تعریضاً ایسی غزلیں لکھ کر لاتے تھے جو الفاظ و ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و شان دار معلوم ہوتی تھیں، مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔ . . .

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اُردو اور فارسی دیوان میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ اُردو میں ایک جگہ کہتے ہیں :

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک اور اُردو غزل کا مطلع ہے :

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

یعنی اگر خاموشی سے یہ فائدہ ہے کہ حال دل ظاہر نہیں ہوتا
تو میں خوش ہوں کہ میرا بولنا بھی خاموشی ہی کا فائدہ دیتا ہے،
کیونکہ میرا کلام کسی کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

چونکہ مرزا کی طبیعت فطرتاً نہایت سلیم واقع ہوئی تھی، اس لیے نکتہ چینوں کی تعریضوں سے ان کو بہت تنبّہ ہوتا تھا اور آہستہ آہستہ ان کی طبیعت راہ پر آتی جاتی تھی۔ اس کے سوا جب مولوی فضل حق سے مرزا کی راہ و رسم بہت بڑھ گئی اور مرزا اُن کو اپنا خالص و مخلص دوست اور خیر خواہ سمجھنے لگے تو اُنھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی، یہاں تک کہ انہیں کی تحریک سے اُنھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اُس کے بعد اس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

مرزا نے ریختہ میں جو روش ابتداء میں اختیار کی تھی، ظاہر ہے کہ وہ کسی طرح مقبول خاص و عام نہیں ہو سکتی تھی؛ لوگ عموماً میر، سودا، میر حسن، جرأت اور انشاء وغیرہ کا سیدھا سادا اور صاف کلام سننے کے عادی تھے، جو محاورے، روزمرہ کی بول چال اور بات چیت میں برتے جاتے تھے، اُنہیں کو جب اہل زبان وزن کے سانچے میں ڈھلا ہوا دیکھتے تھے تو اُن کو زیادہ لذت آتی تھی اور زیادہ لطف حاصل ہوتا تھا۔ شعر کی بڑی خوبی یہی سمجھی جاتی تھی کہ ادھر قائل کے منہ سے نکلا اور اُدھر سامع کے دل میں اُتر گیا، مگر مرزا کے ابتدائی ریختے میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ جیسے خیالات اجنبی تھے، ویسی ہی زبان غیر مانوس تھی۔ فارسی زبان کے مصادر، فارسی کے حروف ربط اور توابع فعل، جو کہ فارسی کی خصوصیات میں سے ہیں، ان کو مرزا اردو میں عموماً استعمال کرتے تھے۔ اکثر اشعار ایسے ہوتے تھے کہ اگر ان میں ایک لفظ بدل دیا جائے تو سارا شعر فارسی زبان کا ہو جائے۔ بعض اسلوب بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ ان سے پہلے اردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں، مثلاً اُن کے موجودہ اُردو

دیوان میں ایک شعر ہے :

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ

ای نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

میں نے خود اس کے معنی مرزا سے پوچھے تھے ۔ فرمایا کہ اے کی جگہ جز پڑھو، معنی خود سمجھ میں آ جائیں گے ۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قمری جو ایک کف خاکستر سے زیادہ اور بلبل جو ایک قفس عنصری سے زیادہ نہیں، اُن کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت صرف اُن کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے۔ یہاں جس معنی میں مرزا نے اے کا لفظ استعمال کیا ہے ظاہرا یہ انہیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سن کر کہا کہ ''اگر وہ اے کی جگہ جز کا لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع اس طرح کہتے :

'اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق کا کیا ہے'

تو مطلب صاف ظاہر ہو جاتا۔'' اُس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا چونکہ معمولی اسلوبوں سے تا بہ‌مقدور بچتے تھے اور شارع عام پر چلنا نہیں چاہتے تھے، اس لیے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرز خیال اور طرز بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے ۔

مرزا کے ابتدائی کلام کو مہمل و بے معنی کہو یا اس کو اُردو زبان کے دائرے سے خارج سمجھو، مگر اس میں شک نہیں کہ اس سے اُن کی ارجنیلٹی اور غیرمعمولی اُپج کا خاطر خواہ سراغ ملتا ہے اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں ان کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں ۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگ ڈنڈی پر اگلی بھیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے، اسی پر آنکھیں بند کر کے گلے کے پیچھے پیچھے ہو لیں اور لیک سے ادھر ادھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں ۔ جو ہنر یا پیشہ اختیار کریں اس میں اگلوں کی چال ڈھال سے سر مو تجاوز نہ کریں اور ان کے

نقش قدم پر قدم رکھتے چلے جائیں ۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے ایسا نہیں کرتے، بلکہ دوسرے رستے پر چلنا اُن کی قدرت سے باہر ہوتا ہے ۔

برخلاف اس کے جن کی طبیعت میں ارجنیلٹی اور غیر معمولی اُپج کا مادہ ہوتا ہے وہ اپنے میں ایک ایسی چیز پاتے ہیں جو اگلوں کی پیروی پر ان کو مجبور نہیں ہونے دیتی ۔ ان کو قوم کی شاہراہ کے سوا بہت سی راہیں ہر طرف کھلی نظر آتی ہیں ۔ وہ جس عام روش پر اپنے ہم فنوں کو چلتا دیکھتے ہیں اس پر چلنے سے ان کی طبیعت ابا کرتی ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ جو طریق غیر مسلوک وہ اختیار کریں، وہ منزل مقصود تک پہنچانے والا نہ ہو، مگر یہ ممکن نہیں کہ جب تک وہ دائیں بائیں چل پھر کر طبیعت کی جولانیاں نہ دیکھ لیں اور تھک کر چور نہ ہو جائیں، عام راہگیروں کی طرح آنکھیں بند کر کے شارع عام پر پڑ جائیں۔

مرزا کی طبیعت اسی قسم کی واقع ہوئی تھی ۔ وہ عام روش پر چلنے سے ہمیشہ ناک چڑھاتے تھے ۔ وہ خست شرکا کے سبب خود شاعری سے نفرت ظاہر کرتے تھے، عامیانہ خیالات اور محاورات سے جہاں تک ہو سکتا تھا اجتناب کرتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔

بہر حال مرزا ایک مدت کے بعد اپنی بیراہ روی سے خبردار ہوئے اور استقامت طبع اور سلامتیٔ ذہن نے اُن کو راہ راست پر ڈالے بغیر نہ چھوڑا ۔ گو اُن کا ابتدائی کلام جس کو وہ حد سے زیادہ جگر کاوی اور دماغ سوزی سے سرانجام کرتے تھے، مقبول نہ ہوا، مگر چونکہ قوت متخیلہ سے بہت زیادہ کام لیا گیا تھا اور اس لیے اُس میں ایک غیر معمولی بلند پروازی پیدا ہو گئی تھی، جب قوت ممیزہ نے اس کی باگ اپنے قبضے میں لی تو اُس نے وہ جوہر نکالے جو کسی کے وہم و گمان میں نہ تھے ۔

یہاں یہ امر جتا دینا ضروری ہے کہ مرزا نے ریختہ گوئی کو اپنا فن قرار نہیں دیا تھا، بلکہ محض تفنن طبع کے طور پر کبھی

اپنے دل کی اُپج سے، کبھی دوستوں کی فرمائش سے اور کبھی بادشاہ یا ولی عہد کے حکم کی تعمیل کے لیے ایک آدھ غزل لکھ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اردو دیوان میں غزل کے سوا کوئی صنف بقدرِ معتدبہ نہیں پائی جاتی۔ وہ منشی نبی بخش مرحوم کو ایک خط میں لکھتے ھیں ''بھائی صاحب تم غزل کی تعریف کرتے ھو اور میں شرماتا ھوں، یہ غزلیں کاھے کو ھیں، پیٹ پالنے کی باتیں ھیں۔ میرے فارسی کے قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی اُن کا لطف نہیں اُٹھاتا۔ اب قدر دانی اس بات پر منحصر ہے کہ گاہ گاہ حضرت ظل سبحانی فرما بیٹھتے ھیں کہ بھئی تم بہت دن سے کوئی سوغات نہیں لائے، یعنی نیا ریختہ، ناچار کبھی کبھی یہ اتفاق ہوتا ہے کہ کوئی غزل کہہ کر لے جاتا ھوں۔''

قطع نظر اس کے وہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اُردو شاعری کو داخل کمالات نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اُس میں اپنی کسر شان جانتے تھے، چنانچہ ایک فارسی قطعہ جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں شیخ ابراھیم ذوق کی طرف خطاب ہے، کہتے ھیں :

فارسی بین تا بہ بینی نقش‌ھائی رنگ رنگ
بگزر از مجموعہ اُردو کہ بے رنگ من ست
راست مے گویم من و از راست سر نتواں کشید
ھر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

مگر چونکہ مرزا کے معاصرین اکثر نکتہ سنج اور نکتہ شناس تھے، اس لیے وہ ریختہ کے سرانجام کرنے میں بھی اپنی پوری توجہ اور ھمت صرف کرتے تھے اور دونوں زبانوں میں اپنی فوقیت اور برتری قائم رکھنے کی برابر فکر رکھتے تھے۔

یہ بات یاد رکھنی چاھیے کہ شاعر اور اُس کے کلام کے رتبے کا اندازہ اُس کے کلام کی قلت اور کثرت سے نہیں ھوتا، بلکہ اس بات سے ھوتا ہے کہ اُس کے منتخب اور برگزیدہ اشعار کس درجے کے ھیں۔

میر کی قدر لوگ اس لیے نہیں کرتے کہ اُس نے متعدد ضخیم دیوان چھوڑے ہیں، بلکہ صرف اُس کے منتخب اشعار نے جو تعداد میں نہایت قلیل ہیں، اُس کو تمام ریختہ گو شاعروں کا سرتاج بنا دیا ہے۔ لطف علی خاں آذر ''آتش کدہ'' میں نوری صفاہانی کی نسبت لکھتا کہ اُس کے دیوان کا مختصر ہونا ہی اُس کے کلام کی خوبی اور حسن طبع کی کافی دلیل ہے۔ یہ بھی معلوم رہےکہ تمام شعراء کا کلام ایک ہی معیار سے نہیں جانچا جاتا، ورنہ فردوسی و نظامی دونوں مثنوی میں اور انوری و خاقانی دونوں قصیدے میں مسلم الثبوت نہیں ٹھہر سکتے، کیونکہ انوری کا قصیدہ اور فردوسی کی مثنوی باعتبار سادگی اور صفائی و عام فہم ہونے کے خاقانی کے قصیدے اور نظامی کی مثنوی سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے، حالانکہ چاروں شخص فارسی شاعری کے رکن رکین مانے جاتے ہیں۔ پس ضرور ہے کہ جدا جدا کلام جدا جدا معیاروں سے جانچے جائیں۔ مرزا کے اُردو کلام میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، غزل کے سوا کوئی صنف شمار کے قابل نہیں ہے۔ مرزا کی موجودہ غزلیات گو بمقابلہ بعض شعراء کے تعداد میں کیسی ہی قلیل ہوں، لیکن جس قدر منتخب اور برگزیدہ اشعار مرزا کی غزلیات میں موجود ہیں وہ تعداد میں کسی بڑے سے بڑے دیوان کے انتخابی اشعار سے کم نہیں ہیں اور جس قدر بلند اور عالی خیالات مرزا کے ریختہ میں سے نکلیں گے اس قدر کسی ریختہ کے کلام میں نکلنے کی توقع نہیں ہے؛ البتہ ہم کو مرزا کے عمدہ اشعار کے جانچنے کے لیے ایک جداگانہ معیار مقرر کرنا پڑے گا جس کو امید ہے کہ اہل انصاف تسلیم کریں گے۔

میر و سودا اور ان کے مقلّدین نے اپنی غزل کی بنیاد اس بات پر رکھی ہے کہ جو عاشقانہ مضامین صدیوں اور قرنوں سے اولاً فارسی اور اس کے بعد اردو غزل میں بندھتے چلے آتے ہیں وہی مضامین بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب بیان عامہ اہل زبان کی معمولی بول چال

اور روز مرہ میں ادا کیے جائیں، چنانچہ میر سے لے کر ذوق تک جتنے مشہور غزل گو مرزا کے سوا اھل زبان میں گزرے ھیں، ان کی غزل میں ایسے مضامین بہت ھی کم نکلیں گے جو اس محدود دائرے سے خارج ھوں۔ ان کی بڑی کوشش یہ ھوتی تھی کہ جو مضامین پہلے متعدد طور پر بندھ چکے، وھی مضمون ایسے بلیغ اسلوب میں ادا کیا جائے کہ تمام اگلی بندشوں سے سبقت لے جائے۔ برخلاف اس کے مرزا نے اپنی غزل کی عمارت دوسری بنیاد پر قائم کی ھے۔ ان کی غزل میں زیادہ‌تر ایسے اچھوتے مضامین پائے جاتے ھیں جن کو اور شعراء کی فکر نے بالکل مس نہیں کیا اور معمولی مضامین ایسے طریقے میں ادا کیے گئے ھیں جو سب سے نرالا ھے اور ان میں ایسی نزاکتیں رکھی گئی ھیں جن سے اکثر اساتذہ کا کلام خالی معلوم ھوتا ھے۔

خلاصہ یہ ھے کہ اور لوگوں نے اول سے آخر تک قوم کی شاھراہ سے سر مو انحراف نہیں کیا اور جس چال سے کہ اگلوں نے راہ طے کی تھی اسی چال سے تمام راستہ طے کیا ھے۔ مرزا نے اول شاھراہ کا رخ چھوڑ کر دوسرے رخ چلنا اختیار کیا اور جب راہ کی مشکلات نے مجبور کیا تو ان کو بھی آخر اسی رخ پر چلنا پڑا، مگر جس لیک پر قافلہ جا رہا تھا اس کے سوا ایک اور لیک اسی کے متوازی اپنے لیے نکالی اور جس چال پر اور لوگ چل رہے تھے اس چال کو چھوڑ کر دوسری چال اختیار کی؛ چنانچہ ھم دیکھتے ھیں کہ جب میر و سودا اور ان کے مقلدین کے کلام میں ایک ھی قسم کے خیالات اور مضامین دیکھتے دیکھتے جی اکتا جاتا ھے اور اس کے بعد مرزا کے دیوان پر نظر ڈالتے ھیں تو اس میں ھم کو ایک دوسرا عالم دکھائی دیتا ھے اور جس طرح کہ ایک خشکی کا سیاح سمندر کے سفر میں یا ایک میدان کا رہنے والا پہاڑ پر جا کر ایک بالکل نئی اور نرالی کیفیت مشاھدہ کرتا ھے اسی طرح مرزا کے دیوان میں ایک اور ھی سماں نظر آتا ھے۔ یہاں اول ھم چند شعر مرزا کے دیوان سے ایسے نقل کرتے ھیں جن سے ان کے خیالات کا اچھوتا پن

ثابت ہوتا ہے۔

اخلاق

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے، مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعوٰی یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے، اس کا بھی انسان بننا مشکل ہے۔ یہ منطقی استدلال نہیں ہے، بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

فطرت انسانی

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں، نشاط کار، یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔ یہ بھی جہاں تک کہ معلوم ہے ایک نیا خیال ہے اور نرا خیال ہی نہیں، بلکہ فیکٹ ہے، کیوں کہ دنیا میں جو کچھ چھل پہل ہے، وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبیعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے۔

ترجیح

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے۔ پہلے مصرعے کے معنی ظاہر

ہیں، دوسرے مصرعے سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو کیا برائی ہوتی، مگر قائل کا مقصود یہ ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیے کہ میں کیا چیز ہوتا ۔ مطلب یہ کہ خدا ہوتا کیوں کہ پہلے مصرعے میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۔

اخلاق

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

بالکل نیا اور اچھوتا اور باریک خیال ہے اور نہایت صفائی اور عمدگی سے اُس کو ادا کیا گیا ہے ۔ اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو اُس کی فہم کا قصور ہے ۔ دعوٰی یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے، اُسی کے موافق اس کی تائید غیب سے ہوتی ہے اور یہ ثبوت ہے قطرۂ اشک جس کو آنکھوں میں جگہ ملی ہے، اگر اس کی ہمت جب کہ وہ دریا میں تھا، موتی بننے پر قانع ہو جاتی تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے، یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا ۔

عاشقانہ

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

''لاگ'' دشمنی اور ''لگاؤ'' محبت ۔ یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو، مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا، اگر کسی نے باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی و لطافت سے ہر گز نہ باندھا ہوگا ۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے نہ دوستی: اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لیے کہ اُس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے، ہم اُسی کو دوستی سمجھتے، لیکن جب نہ دوستی ہو اور

نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکا کھائیں ـ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے ''لاگ'' اور ''لگاؤ'' ایسے دو لفظ بہم بہنچائے ہیں جن کا ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو چہار چند کر دیا ہے ـ

فضیلت نوع انسانی

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا ـ شاعر کہتا ہے کہ برق تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے نہ کوہ طور، کیوں کہ شراب خوار کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے ـ پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے، وہ کیوں کر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے ـ یہ خیال بھی مع اس تمثیل کے جو اس میں بیان ہوئی ہے، بالکل اچھوتا خیال معلوم ہوتا ہے ـ

شوخی

حریف مطلب مشکل نہیں فسون نیاز
دعا قبول ہو یارب کہ عمر خضر دراز

چونکہ خیال وسیع تھا اور مضمون مطلع میں بندھنے کا مقتضی تھا، اس لیے پہلا مصرع اردو روز مرہ سے کسی قدر بعید ہو گیا ہے، مگر بالکل ایک نئی شوخی ہے جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہو گی ـ کہتا ہے کہ مشکل مقصد کے حاصل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا، لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے جو پہلے ہی دی جا چکی ہو ـ

شوخی

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اس میں بھی نئی طرح کی شوخی ہے جو باکل اچھوتی ہے؛ بظاہر درخواست کرتا ہے کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ اور در پردہ الزام دیتا ہے، گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیوں کر دوں وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ جب اُن کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیے ہیں اور جو شمار میں اُسی کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں، اُن کی گنتی یاد آتی ہے۔ گناہوں اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہوا تو بسبب عدم استطاعت کے اُس کو خاطر خواہ نہ کر سکا، کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہوا اور وصل میسر آیا تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کیے ہیں اُتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

شکایت اہل وطن

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے، اس پر خدا کا اس لیے شکر کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں کیونکہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون تھا اور کس رتبے کا آدمی تھا؟ لیکن وطن میں مرنا جہاں ایک زمانہ واقف حال ہو مگر خیرخواہ و غم خوار ایک بھی نہ ہو، وہاں مردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی؛ پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے فی‌الحقیقت سراسر اہل وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرائے میں ظاہر کیا ہے۔

تصوف

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آئے اس کو شہود کہتے ہیں اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیّت ذات ہے جو عقل و ادراک و بصر و بصیرت سے وراء الوراء ہے ۔ کہتا ہے کہ جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں وہ درحقیقت غیب الغیب ہے اور اس کو غلطی سے شہود سمجھنے میں ہماری ایسی مثال ہے جیسے کوئی خواب میں دیکھے کہ میں جاگتا ہوں؛ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب میں ہے ۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لیے مثال نہیں ہو سکتی ۔

عاشقانہ

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

عشق حقیقی ہو یا مجازی اس کے زخم کی گہرائی اس سے بہتر کسی اسلوب میں بیان نہیں ہو سکتی ۔

اخلاق

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نرالا خیال ہی نہیں بلکہ فیکٹ ہے اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اُس سے زیادہ تصور میں نہیں آ سکتا ۔ مشکلات کی کثرت کا اندازہ ضد حقیقی یعنی اُن کے آساں ہو جانے سے کرنا درحقیقت حسن مبالغہ کی معراج ہے جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی ۔

عاشقانہ

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

ایک فیکٹ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے - اس مضمون کو چاہو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مجاز پر محمول کرو، دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آساں نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی کیونکہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے، مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آساں نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں اور اس لیے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی -

وفاداری

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بت خانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو کعبے میں دفن کیا جائے کیونکہ اس نے وفاداری کا حق پورا پورا ادا کر دیا اور یہی ایمان کی اصل ہے -

تصوف

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یعنی جب تک بہشت قائم ہے لوگ عبادت اس امید پر کرتے ہیں کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی - پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیے، تاکہ یہ لالچ باقی نہ رہے اور لوگ خالصۃً لوجہ اللہ عبادت کریں -

حسنِ بیان کی تعریف

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نکلے وہ سامع کے دل میں اس طرح اُتر جائے کہ اس کو یہ شبہہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی۔

اخلاق

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

جام جم پر جام سفال کو کس طرح خوبی سے ترجیح دی ہے کہ اس کی کچھ تعریف نہیں ہو سکتی اور بالکل نیا خیال ہے جو کہیں نظر سے نہیں گزرا۔

تصوف

رہا آباد عالم اهل همت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مے خانہ خالی ہے

یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گزرا ہو، مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں اگر اہل همت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے تو دنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیے کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے کہ اہل همت مفقود ہیں، یعنی جس طرح مے خانے میں جام و سبو کا شراب سے بھرا ہوا رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ مے خانے میں کوئی مے خوار نہیں ہے، اسی طرح عالم کا آباد ہونا دلالت کرتا ہے کہ اس میں اہل همت معدوم ہیں۔

نا امیدی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

نا امیدی کی غایت اس سے بڑھ کر اور ایسی خوبی سے شاید ہی کسی نے بیان کی ہو۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یعنی جو گناہ ہم نے کیے ہیں اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی داد بھی ملنی چاہیے۔

علاوہ جدت مضامین اور طرفگئی خیالات کے اور بھی چند خصوصیتیں مرزا صاحب کے کلام میں ایسی ہیں جو اور ریختہ گویوں کے کلام میں شاذ و نادر پائی جاتی ہیں۔ اولًا عام اور متبذل تشبیہیں جو عمومًا ریختہ گویوں کے کلام میں متداول ہیں، مرزا جہاں تک ہو سکتا ہے ان تشبیہوں کو استعمال نہیں کرتے، بلکہ تقریبًا ہمیشہ نئی نئی تشبیہیں ابداع کرتے ہیں۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے، بلکہ خیالات کی جدت ان کو جدید تشبیہیں پیدا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ان کے ابتدائی ریختہ میں جو تشبیہیں دیکھی جاتی ہیں وہ اکثر غرابت سے خالی نہیں ہیں، مثلًا سانس کو موج سے، بے خودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغز سر کو پنبۂ بالش سے، دانۂ انگور کو عقد وصال سے، استخوان کو خشت اور بدن کو قالب خشت سے، اور اسی قسم کی اور بہت سی عجیب و غریب تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختہ میں پائی جاتی ہیں، لیکن جس قدر خیالات کی اصلاح ہوتی گئی اسی قدر تشبیہوں میں باوجود ندرت اور طرفگی کے سنجیدگی اور لطافت بڑھتی گئی، مثلًا وہ کہتے ہیں :

مثال ۱

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغ راہ گزار باد یاں

یہاں سورج کو اس لحاظ سے کہ وہ بھی اجزائے عالم میں سے ہے اور تمام اجزائے عالم آمادۂ زوال و فنا ہیں، چراغ راہ گزار باد سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔

مثال ۲

دوسری جگہ سورج کو اس لحاظ سے کہ حسن معشوق کے مقابلے میں اس کو ناقص الخلقۃ قرار دیا ہے، ماہ نخشب کے ساتھ تشبیہ دی ہے، چنانچہ کہتے ہیں :

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

مثال ۳

ایک جگہ انسان کی زندگی کو اس لحاظ سے کہ جب تک موت نہیں آتی اس کو غم سے نجات نہیں ہوتی، شمع سے تشبیہ دی ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی وہ برابر جلتی رہتی ہے، جیسا کہ کہتے ہیں :

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس قسم کی بدیع و نادر تشبیہات سے مرزا کے دونوں دیوان اُردو اور فارسی بھرے ہوئے ہیں۔ قطع نظر تشبیہات کے مرزا ہر ایک بات میں جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، ابتذال سے بہت بچتے تھے۔ مبتذل مضامین، مبتذل تشبیہیں، مبتذل محاورے، مبتذل ترکیبیں جس قدر اُن کے کلام میں کم ملیں گی، ظاہراً کسی ریختہ گو شاعر کے

کلام میں نہیں مل سکتیں ۔ مثلاً صلّ علٰی ہ کا لفظ جو بجائے سبحان اللہ وغیرہ کے استعمال ہوتا ہے اس کو وہ کبھی جائز نہیں رکھتے تھے، یہاں تک کہ شاگردوں کی غزل میں بھی ہمیشہ اس لفظ کو کاٹ کر نام خدا یا کوئی اور لفظ بنا دیتے تھے ۔ اسی طرح جو محاورے یا الفاظ صرف عامۃالناس کی زبان پر جاری ہیں اور خواص ان کو کبھی نہیں بولتے، تا بہ مقدور وہ ان کو استعمال نہیں کرتے تھے، اگرچہ ہمارے نزدیک ایسا التزام کرنے سے زبان کا دائرہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے اور لٹریچر کو وسعت دینا جو شاعری کا اصل مقصد ہونا چاہئے، وہ فوت ہو جاتا ہے، مگر مرزا کے کلام میں جو خصوصیتیں ہم کو معلوم ہوئی ہیں، ان کا بیان کرنا ضرور ہے ۔

دوسری خصوصیت

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرزا نے استعارہ و کنایہ و تمثیل کو جو کہ لٹریچر کی جان اور شاعری کا ایمان ہے اور جس کی طرف ریختہ گو شعرا نے بہت کم توجہ کی ہے، ریختہ میں بھی نسبۃً اپنے فارسی کلام سے کم استعمال نہیں کیا اور شعرا نے استعارے کو صرف محاورات اُردو میں بلا شبہہ استعمال کیا ہے، لیکن استعارے کے قصد سے نہیں، بلکہ محاورہ بندی کے شوق میں ۔ استعارے بلا قصد ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں، یہاں چند مثالیں مرزا کے کلام سے نقل کی جاتی ہیں۔

مثال ۱

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہاں اس مطلب کو کہ معشوق نے آن کی آن اپنی صورت دکھا دی تو اس سے کیا تسلی ہو سکتی ہے، اس طرح ادا کیا ہے " بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ۔"

۵ ۔ مرزا کہتے تھے کہ حرف جار بغیر مجرور کے بولنا ایک عامیانہ اور سوقیانہ بول چال ہے ۔

مثال ۲

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا وقت سفر یاد آیا

دوست کو رخصت کرتے وقت جو دردناک کیفیت گزری تھی اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ رہ کر یاد آتی ہے اس میں جو کبھی کبھی کچھ وقفہ ہو جاتا ہے، اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا۔ ایسے بلیغ شعر اردو زبان میں کم دیکھے گئے ہیں ۔ جو حالت فی الواقع ایسے موقع پر گزرتی ہے، ان دو مصرعوں میں اُس کی تصویر کھینچ دی ہے جس سے بہتر کسی اسلوب بیان میں یہ مضمون ادا نہیں ہو سکتا ۔

مثال ۳

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

جو مطلب اس شعر میں ادا کیا گیا ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ انسان کو درجۂ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

مثال ۴

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

جو مطلب اس طریقے سے ادا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا تھا۔

مثال ۵

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

دوسرے مصرع میں یہ مضمون ادا کیا گیا ہے کہ جب مشکلات نے نہیں گھیرا تھا اس وقت ان کے دفع کرنے کی طاقت تھی۔

ان اشعار میں جیسا کہ ظاہر ہے اصل خیالات سیدھے سادے ہیں مگر استعارے اور تمثیل نے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کر دی ہے ۔

تیسری خوصیت

تیسری خصوصیت کیا ریختہ میں اور کیا فارسی میں، کیا نظم میں اور کیا نثر میں، باوجود سنجیدگی و متانت کے شوخی و ظرافت ہے جیسا کہ مرزا کے انتخابی اشعار سے ظاہر ہوگا - مرزا سے پہلے ریختہ گو شعرا میں دو شخص شوخی و ظرافت میں بہت مشہور گزرے ہیں؛ ایک سودا، دوسرا انشاء، مگر دونوں کی تمام شوخی و خوش طبعی ہجو گوئی یا فحش و ہزل میں صرف ہوئی، بخلاف مرزا غالب کے کہ انھوں نے ہجو یا فحش و ہزل سے کبھی زبان قلم کو آلودہ نہیں کیا -

چوتھی خصوصیت

چوتھی خصوصیت مرزا کی طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی گئی ہے اور جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ‌الامتیاز کہا جا سکتا ہے - ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں، مگر غور کرنے کے بعد اس میں ایک دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں، لطف نہیں اٹھا سکتے - یہاں ایسے اشعار کی چند مثالیں لکھی جاتی ہیں :

مثال ۱

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے، یعنی خوف معلوم ہوتا ہے، مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی، مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے -

مثال ۲

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں، مے مرد افگن عشق کا ساتھی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے، یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے، مطلب یہ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا، اس لیے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوئی ہے، مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے، اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرع بھی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرع کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے ''کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق'' یعنی کوئی ہے جو مے مرد افگن عشق کا حریف ہو؟ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اسی مصرع کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے ''کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق'' یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجے اور طرز ادا کو بہت دخل ہے؛ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرع مذکور کی تکرار کروگے فوراً یہ معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔

مثال ۳

کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا، اس لیے جان کو عزیز نہیں رکھتا اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اس بت پر جان قربان کرنا تو عین ایمان ہے، پھر اس سے جان کیوں کر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

مثال ۴

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارا نہ ہوتی اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے اور دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں کہ اس شعر میں آدم اور فرشتوں کے اس قصے کی طرف اشارہ ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو فرشتوں نے کہا ''کیا تو دنیا میں اُس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خون ریزی کرے؟'' وہاں سے ارشاد ہوا کہ ''تم نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں'' اور پھر اس آدم سے ان کو زک دلوائی اور حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں ۔ کہتا ہے کہ ہم آج دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں کل تک تو ہماری ایسی عزت تھی ۔

مثال ۵

ترے سر و قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ تیرے سروقامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے اور دوسرے یہ معنی بھی ہیں کہ تیرا قد اُسی میں سے بنایا گیا ہے، اس لیے وہ ایک قد آدم کم ہو گیا ہے۔

مثال ٦

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

اس شعر میں ''ترے سر کی قسم ہے ہم کو'' اس جملے کے دو معنی ہیں، ایک یہ کہ ترے سر کی قسم ہے ہم ضرور سر اڑائیں گے اور

دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے، یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے، جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے، یعنی کبھی ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔

مثال ۷

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

اس کا مطلب ایک تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی‌الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت برپا کرو۔

مثال ۸

کیا خوب ! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

''ہمارے بھی منہ میں زبان ہے'' اس میں دو معنی رکھے ہیں، ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں کہ اگر بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دیں گے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا یا نہیں۔

مثال ۹

زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

''کون اٹھاتا ہے مجھے'' اس کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے وہاں سے کون اٹھاتا ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ محفل سے تو اٹھا دیتے تھے دیکھوں اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

مثال ۱۰

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے اس میں باد پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دئیے ہیں۔ باد پیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں ۔ پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں کہ فصل بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے اور جب کہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی، یعنی فضول کام ہے، اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا اور باد پیمائی خبر ۔ دوسرے معنی یہ ہیں باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں اسی طرح باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لیے جائیں ۔ اس صورت میں یہ مطلب نکلے گا کہ آج کل ہوا کھانا بھی شراب پینا ہے ۔

مذکورہ بالا خصوصیتوں کے علاوہ ایک اور بات قابل ذکر ہے جو مرزا اور ان کے بعض معاصرین و متبعین کی غزل میں عموماً پائی جاتی ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ ریختہ کی بنیاد فارسی غزل پر رکھی گئی ہے، جو جذبات اور خیالات اہل ایران نے غزل کے پیرایہ میں ظاہر کیے ہیں، ریختہ گویوں نے زیادہ تر بلکہ بالکل انہیں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھالا ہے، پس جو انقلاب ایک مدت کے بعد فارسی غزل میں پیدا ہوا، ضرور تھا کہ وہی انقلاب اردو غزل میں ایک عرصے کے بعد پیدا ہوتا ۔ قدمائے اہل ایران جن کا دور مولانا جامی پر ختم ہوتا ہے، ان کی غزل میں جو جذبات و خیالات بیان ہوئے ہیں، وہ اپنی نیچرل حالت سے متجاوز نہیں ہوئے اور گو اسالیب بیان میں تلاحق افکار کے سبب رفتہ رفتہ بہت وسعت اور لطافت پیدا ہو گئی لیکن بیان کا طریقہ نیچرل سادگی کی حد سے آگے نہیں بڑھا، مگر چونکہ خیالات نہایت محدود تھے ایک مدت کے بعد جتنے سیدھے سادھے عمدہ اور لطیف اسلوب

تھے وہ سب نبڑ گئے اور متاخرین کے لیے ایک چچوڑی ہوئی ہڈی کے سوا اور کچھ باقی نہ رہا۔ اگر متاخرین غزل کو ہر قسم کے خیالات ظاہر کرنے کا آلہ بناتے تو ان کے لیے میدان غیر متناہی موجود تھا، مگر انھوں نے اس محدود دائرے سے باہر نکلنا نہ چاہا۔ اب جو لوگ تقلید کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے انھوں نے تو اُسی چچوڑی ہوئی ہڈی پر قناعت کی، مگر جن کی فطرت میں ارجنیلٹی اور اُپچ کا مادہ تھا وہ انھیں قدیم خیالات و جذبات میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے۔ چنانچہ نظیری، ظہوری، عرفی، طالب، اسیر اور اُن کے اقران و امثال کی غزل میں بمقابلہ سعدی، حافظ، خسرو وغیرھم کی غزل کے ہم اس قسم کا تفاوت پاتے ہیں، مثلاً خواجہ حافظ کہتے ہیں:

گنہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب باش و گو گناہ من است

نظیری نے اسی مضمون کو حقیقت سے مجاز میں لا کر اس میں ایک نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے۔ وہ کہتا ہے:

تا منفعل ز رنجش بے جا نہ بینمش
مے آرم اعتراف گناہ نبودہ را

یا مثلاً دوسری جگہ خواجہ حافظ کہتے ہیں:

از عدالت نبود دور گرش پرسد حال
پادشاہے کہ بہمسایہ گدائے دارد

ظہوری کے ہاں یہ سیدھا سادہ خیال ابراہیم عادل شاہ کے حق میں جو کہ اُس کا ممدوح بھی ہے اور محبوب بھی ایک نئے انداز سے بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے:

مروت کردہ شبہا بر تو سیر بام و در لازم
نمے باشد چراغی، خانۂ بے دستگاہاں را

یعنی چونکہ بے مقدور لوگوں کے گھر میں چراغ نہیں ہوتا اس لیے مروت اور کرم نے تجھ پر لازم کر دیا ہے کہ راتوں کو کوٹھے پر

چڑھ کر ٹہلا کرے تا کہ تیرے چہرے کی روشنی سے ان کے گھر میں چاندنا ہو جائے۔ مطلب یہ کہ ان کے حال سے واقف ہو کر ان کی مدد کرے۔

مگر یہ انقلاب فارسی غزل میں کم و بیش چار سو برس بعد ظہور میں آیا تھا کیوں کہ نئی طرز اس وقت تک ایجاد نہیں ہوتی جب تک ضرورتیں اہل فن کو سخت مجبور نہیں کرتیں ۔ لیکن ریختہ میں یہ انقلاب ڈیڑھ سو برس کے اندر اندر پیدا ہو گیا کیونکہ متاخرین اہل ایران کا نمونہ موجود تھا اس لیے نئی طرز کے ایجاد کرنے کی ضرورت نہ تھی بلکہ جو طرز فارسی میں متاخرین نکال چکے تھے اسی کو ریختہ میں ڈھالنا تھا۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی۔ کیونکہ جس طرح کیمسٹری کے مدون ہونے اور علم کے درجے پر پہنچنے سے پہلے اس کے متفرق اصول مشرقی ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے اسی طرح مرزا سے پہلے بھی بعض شعرا کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلکی سی نظر آ جاتی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ اول مرزا نے اور انہیں کی تقلید سے مومن، شیفتہ، تسکین، سالک، عارف، داغ وغیرھم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا، خصوصاً مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے ہیں۔ یہاں ایسی ایک دو مثال لکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے جس سے ناظرین بخوبی سمجھ جائیں کہ متاخرین کے اس خاص گروہ نے قدما کے سیدھے سادے خیالات اور معمولی اسلوبوں میں کس قسم کی نزاکتیں اور لفظی و معنوی تصرفات کرکے اُن میں ندرت اور طرفگی پیدا کی ہے، مثلاً میر تقی کا شعر ہے:

میری تغئیر رنگ پر مت جا　　اتفاقات ہیں زمانے کے

اسی تغئیر رنگ کو مومن خاں نے اس طرح باندھا ہے۔

میری تغئیر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یا مثلاً خواجہ میر درد نے معشوق کے رخِ روشن کو شمع پر اس طرح ترجیح دی ہے :

رات مجلس میں ترے حسن کے شعلے کے حضور
شمع کے منہ پر جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

نواب مرزا خاں داغ نے اسی مضمون میں نئی طرح کی نزاکت پیدا کی ہے، وہ کہتے ہیں :

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

الغرض اس قسم کی معنی آفرینیاں غالب، مومن اور اُن کے متبعین کے کلام میں پائی جاتی ہیں ۔ چونکہ اس موقع پر صرف مرزا کے کلام پر بحث کرنی مقصود ہے، اس لیے چند شعر مرزا کی غزلیات میں سے اسی قبیل کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں :

ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے
نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

کرنے لگا ہے باغ میں تو بے حجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

ضد کی ہے اور بات، مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

اس کی بزم آرائیاں سن کر دلِ رنجور یاں
مثلِ نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

نقش کو اُس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچا جائے ہے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

نسیۂ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم
لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

پہلے شعر میں خون کا رنگ ہو کر اُڑ جانا، دوسرے میں عاشق کے جذبے اور معشوق کی کشیدگی سے کشاکش کا لازم آنا، تیسرے میں نگہت گل سے حیا آنی، چوتھے میں بھولنے سے سینکڑوں وعدے وفا کرنے، پانچویں میں آپ اپنے پر رشک آنا، چھٹے میں دل رنجور کا نقش مدعائے غیر کی طرح بیٹھا جانا، ساتویں میں کھینچنے سے نقش کا مصور سے کھنچنا، آٹھویں میں مٹتے مٹتے آپ اپنی قسم ہو جانا، نویں میں آپ اپنی ہمت عالی کے ہاتھ بک جانا، دسویں میں باوجود موت آنے کے موت نہ آنی، یہ سب متاخرانہ نزاکتیں ہیں جو ولی سے لے کر

میر، سودا اور درد تک کے کلام میں نہ تھیں اور اگر تھیں تو صرف اس قدر جیسے آٹے میں نمک۔

اگرچہ ایران میں زمانہ حال کے شعراء ظہوری و عرفی و طالب و اسیر وغیرہ کی طرز کو ناپسند کرتے ہیں اور ہندوستان میں بھی روز بروز طبیعتیں نیچرل شاعری کی طرف مائل ہوتی جاتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ رفتہ رفتہ اس قسم کے تکلفات اور نزاکتیں نظروں سے گر جائیں، لیکن یہ سب زمانے کے مقتضیات ہیں جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ ایسی باتوں سے ان لوگوں کی استادی اور گراں مایگی میں کچھ فرق نہیں آتا جن کو نئی طرز کے موجد ہونے کا فخر حاصل تھا۔

بہر حال جو نسبت ظہوری، نظیری، عرفی، طالب، اسیر وغیرہم کے کلام کو سعدی، خسرو، حافظ اور جامی کے کلام سے ہے تقریباً ویسی ہی نسبت مرزا کے ریختہ کو، میر، سودا اور درد کے ریختہ سے سمجھنی چاہیے۔ قدمائے اُردو روزمرہ اور صفائی بیان کو سب باتوں سے زیادہ اہم اور مقصود بالذات جانتے تھے، برخلاف متاخرین کے کہ وہ ہر شعر میں ایک نئی بات پیدا کرنے اور اسالیب بیان میں نئے نئے تعجب انگیز اور لطیف و پاکیزہ اختراعات کرنے ہی کو کمال شاعری سمجھتے تھے اور زبان کی صفائی اور روز مرہ کی نشست کو محض خیالات کے ظاہر کرنے کا ایک آلہ (نہ کہ مقصود شاعری) تصور کرتے تھے، چنانچہ مرزا ایک دوست کو خط میں لکھتے ہیں کہ ''بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے، قافیہ پیمائی نہیں ہے''۔ . . .

غالب*

جس غزل کو دیکھئے آن سے آن کی مضمون آفرینی، خلاقیٔ سخن، بلند پروازی، نازک خیالی، زور آوری، وغیرہ عیاں ہے۔ مگر آن کی تمام فارسی غزلوں میں صرف دس پانچ ہی شعر ہوں گے، جو غزلیت کا لطف رکھتے ہوں گے، ورنہ دیوان کا دیوان حسن مقبولیت سے خالی نظر پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ استعارات وغیرہ سے بہت کام لیتے ہیں جو سچی غزل گوئی کی شان سے بہت بعید ہے، فقیر حضرت کا بہت معتقد ہے یعنی آن کو ایک بڑا شاعر گرامی جانتا ہے، مگر افسوس ہے کہ آن کی فارسی کی غزل سرائی کو اپنے دل پر تاثیر پیدا کرتے نہیں پاتا، حضرت کی غزلوں کے اشعار بیشتر قصیدہ نما معلوم ہوتے ہیں اور کچھ ایسی خاص ترکیب رکھتے ہیں کہ آن سے وہ حظ دل کو نصیب نہیں ہوتا ہے جو غزل سرائی کا تقاضا ہے۔ . . .

حقیقت یہ ہے کہ غزل سرائی بہت دشوار چیز ہے۔ یہ بڑے حکیم کا کام ہے اور وہ بھی وہ حکیم جس نے غزل سرائی کی خلقی صلاحیت پائی ہے۔ اگر مجرّد حکمت ماہی غزل گوئی کی متقاضی ہوتی تو ارسطو، بوعلی سینا، ملّا صدرا، یہ سب کے سب غزل گو ہوتے، غزل گوئی خاقانی، مولوی معنوی اور انوری کو تو نصیب ہی نہ ہوئی جو بڑے درجہ کے شعرا گزرے ہیں، مگر حضرت غالب پر بہت تعجب گزرتا ہے کہ آپ اردو کے نہایت اچھے غزل گو ہیں، اگر آن کے دیوان سے وہ اشعار خارج کر دیئے جائیں جو کثرتِ استعارات وکثرتِ اضافات و کثرتِ اغلاق

*کاشف الحقائق معروف بہ بہارستان سخن (۱۸۹۷ء)

سے بد نما نظر آتے ہیں تو آن کے اردو کے کلام منتخب کا جواب نہیں پایا جائے گا۔ بہت جائے حیرت ہے کہ آن کی اردو کی غزلیں سوز و گداز و خستگی و نشتریت و دل گرفتگی و پر تاثیری کے مزے سے قریب قریب میر کی غزلوں کی طرح بھری ہوئی ہیں، مگر فارسی کی غزلیں ان صفات سے جو غزل گوئی کی شان سے ہیں تمام تر معرا نظر آتی ہیں۔ فقیر کی دانست میں مرزا غالب فارسی کی غزل گوئی کے اعتبار سے فارسی کی قصیدہ گوئی میں زیادہ دخل رکھتے ہیں۔ . . .

غالب فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے نام آور شاعر ہیں۔آن کی فارسی کی غزلسرائی کی نسبت اظہار خیالات ہو چکا ہے۔ اب آن کی اردو کی غزلسرائی کی کیفیت عرض کرنے کو ہے۔ غالب آن شاعروں میں ہیں جو ہر صنف شاعری سے مناسبت رکھتے تھے مگر یہاں آن کی اردو کی غزلسرائی زیر بحث ہے۔ حضرت نے ذوق، مومن، ناسخ، آتش، آن استادوں کے زمانے دیکھے اور ان سب اساتذہ کے بعد رحلت فرمائی۔ ذوق سے شاعرانہ سابقہ بھی ظہور میں آیا، مگر مومن سے کیا طور حضرت کا رہا فقیر کو نہیں معلوم۔ ناسخ سے لطف مراسلات حاصل تھا۔ آتش کے ساتھ موافقت یا مخالفت کی کوئی بات علم راقم میں نہیں ہے۔آردو کی غزلسرائی کے اعتبار سے مرزا نوشہ بہت قابل توجہ شاعر ہیں۔اپنی غزلسرائی کی نسبت حضرت فرماتے تھے کہ غزل گوئی کی ابتدا تھی کہ ناسخ مرحوم کا دیوان دهلی میں پہلے پہل پہنچا۔ شیخ کی سخن‌سنجی کی تمام شہر میں دھوم مچ گئی۔ میں نے اور مومن نے آن کا متتبع ہونا چاہا۔ ہم لوگوں نے شیخ مرحوم کے رنگ میں مشق کلام کرنا شروع کیا، مگر شیخ کا رنگ ہم لوگوں میں نہ آیا۔ مومن مشق کے بعد ویسے ہو گئے جیسا کہ آن کا رنگ دیکھا جاتا ہے اور ہم میر کے رنگ میں در آئے۔ اس جگہ پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مومن اور غالب کے عجز اور تتبع کا سبب اور کچھ نہ تھا۔ الّا یہ کہ یہ دونوں شاعران نامی افتاد طبیعت سے داخلی شاعری کے برتنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ پس ناسخ کی شاعری جو محض خارجی

رنگ رکھتی ہے، کیونکر اُن کی خلقی صلاحیت کے ساتھ موافق پڑتی -
بہرحال غالب کا یہ فرمانا کہ ہم میر کے رنگ میں در آئے، واقعات سے
بہت بعید نہیں ہے - حقیقت یہ ہے کہ غالب کی غزلسرائی میں میر کی
جھلک نمایاں ہے- لاریب واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین غالب
قریب قریب میر صاحب کی پرتاثیری کے ساتھ باندھ جاتے ہیں- مگر حالت
یہ ہے کہ اُن کے مختصر دیوان میں بہت کم شعر ہیں جو میر صاحب کی
سادگیٔ کلام کا لطف دکھاتے ہیں - زیادہ حصّہ اُن کے کلام کا استعارات
سے بھرا ہوا ہے - اضافتوں کی وہ بھرمار ہے کہ بعض وقت جی گھبرا اُٹھتا
ہے کہ الٰہی اضافتوں کا سلسلہ کب ختم ہوگا- الفاظ فارسی کی وہ کثرت
دیکھی جاتی ہے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آردو کے اشعار زیرِ نظر
ہیں یا فارسی کے - ان باتوں کے علاوہ کبھی کبھی اخلاقی مضامین کا
وہ عالم دکھائی دیتا ہے کہ ادراک اپنے فعل میں قاصر ہونے لگتا ہے -
بلاشبہہ اُن کے ایسے کلام کوئی لطفِ غزلیت نہیں رکھتے، اگر اُن کے
دیوان کا کوئی انتخاب جدید کیا جائے تو لازم ہے کہ ایسے ایسے مغلق اشعار
خارج از دیوان کر دیئے جائیں - لیکن ان معائب سے گزر کر اگر اس
یکتائے روزگار کے کلام کو انصاف کی نگاہ سے دیکھیے تو پھر حسن کی کوئی
انتہا بھی نظر نہیں آتی - واقعی جو سوز، گداز، خستگی، درد، برشتگی،
نشتریت، بلندپروازی، نازک‌خیالی، مکنت، متانت، جلالت، تہذیب، شوخی
غالب کے کلام میں ہے - باستثنائے درد و میر کسی استاد کے کلام میں
نہیں پائی ہے - نشتریت تو ایسے غضب کی ہے کہ میر صاحب کے کلام
میں بھی اس سے زیادہ نہ ہوگی - پرتاثیری کا کیا کہنا - دل بےاختیار
چلاّ اٹھتا ہے کہ غزلسرائی اسے کہتے ہیں - شوخی کا وہ عالم ہے کہ
طبیعت بےچین ہوئی جاتی ہے - عالی مذاقی روح کو عالم بالا کی سیر دکھاتی
ہے - وارداتِ قلبیہ کے مضامین کی خوبی جذباتی معلامات کے تماشے پیش
نظر کر دیتی ہے اور مختصر یہ ہے کہ حضرت کے کمالات گونا گوں کا
وہی قائل نہ ہوگا جسے قلبی نعمتوں سے فطرت نے محروم رکھا ہے - ذیل

میں کچھ کلام معجز نظام نذر ناظرین ہوتا ہے ـ

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑینگے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہوجائیگا

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُنکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے
جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
ہم کو ان سے ہے وفا کی اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید — نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیے
واضح ہو کہ اشعار بالا کے رنگ کے بہت اشعار دیوان غالب میں

موجود هیں - سب کے انتخاب کا یہاں موقع نہیں ہے حضرات شائقین خود دیوان کو ملاحظہ فرما لیں، لیکن چونکہ غزل سرائی حضرت غالب کی سوز و گداز، درد و محبت، خستگی، برشتگی، نشتریت، عالی خیالی، دل آویزی، خوش مذاقی، شیریں بیانی، نفیس پسندی، شوخی، رفعت، مکنت، جلالت، متانت وغیرہ سے معمور ہے - اس لئے چند پوری غزلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں کہ حضرات ناظرین اُن سے حظ روحی اٹھائیں اور ہر چند اُن میں میر صاحب کے کلام کی سادگی نہیں ہے، تو بھی اُن میں غزلیّت کا ایسا لطف ہے کہ یہ لُطف کمتر استادوں کے کلام میں دیکھا جاتا ہے -

غزل نمبر ۱

درد منت کشِ دوا نہ ہوا	میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

. . . .

غزل نمبر ۲

ہوئی تاخیر توکچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

. . . .

غزل نمبر ۳

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

. . . .

غزل نمبر ۴

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

. . . .

غزل نمبر ۵

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

. . . .

غزل نمبر ٦

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

. . . .

غزل نمبر ۷

دل ہی تو ہے، نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

. . . .

غزل نمبر ۸

کسی کو دیکے دل، کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

. . . .

غزل نمبر ۹

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

. . . .

غزل نمبر ۱۰

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

. . . .

غزل نمبر ۱۱

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

. . . .

غزل نمبر ۱۲

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

. . . .

فقیر کی دانست میں اگر کوئی شاعر اپنی تمام عمر میں صرف بارہ غزلیں ایسی جو بالا میں رقم ہوئیں، تصنیف کرے تو اسے صاحبِ دیوانِ ضخیم ہونے کی حاجت نہیں ہے ۔ یہ غزلیں اعلیٰ درجہ کی غزل سرائی کی خبر دیتی ہیں۔ علاوہ ان کے اور بھی غزلیں دیوانِ غالب میں موجود ہیں، جو انتخاب کا حکم رکھتی ہیں۔ یہ بارہ غزلیں تو صرف نمونہ کے طور پر درج کی گئی ہیں ۔ بہرحال یہ بارہ غزلیں اہلِ انصاف کو رائے قائم کرنے کے واسطے کافی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ استاد غالب اُردو میں بڑے غزلسرا گزرے ہیں۔ یوں تو بےعیب ذات خدا کی ہے مگر اس پر بھی اُن کی غزل سرائی معائب غزل سرائی سے بہت کچھ پاک ہے، لاریب اُن کی غزل سرائی قریب قریب غزل کے تقاضوں کے موافق ہے۔ اگر غالب، دردؔ یا میرؔ تک اس صنفِ شاعری میں نہیں پہنچتے ہیں تو ان دونوں استادوں کے بعد اُنہیں کا درجہ ہے۔ واقعی باستثنائے خواجہ و میر کسی کی غزل سرائی ایسی نہیں دیکھی جاتی ہے جو دل کو ہلا دے، یوں تو پرتاثیری سے استادوں کا کلام خالی نہیں ہوتا۔ اس جگہ فقیر اپنی ذاتی کیفیتِ دلی کو عرض کر رہا ہے، نہیں معلوم کہ اس عاجز کا قول کلیہ کا حکم رکھتا ہے یا نہیں، مگر اکثر کیفیتیں جو احقر پر غالب کے شعروں سے گزری ہیں، ان سے اپنی رائے وہی قائم ہوا کی ہے، جسے تجربۂ شخصی کے طور پر اس ہیچمدان نے بالا میں عرض کیا۔ خواجہ میر

درد اور میرتقی میر کے کلاموں کی پرتاثیری سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، مگر غالب کی نسبت بھی فقیر کا یہی عقیدہ ہے کہ ان کے کلام کی تاثیر عجب ڈھنگ رکھتی ہے۔ راقم بہت ایسی صحبتوں میں شریک رہا ہے جہاں بہت سے اُستادوں کے کلام پڑھے گئے ہیں، مگر غالب کے کلام نے رنگ جلسہ کو بدل دیا ہے۔ ایک بار کی سرگزشت ہے کہ بندہ سیر و شکار کی نظر سے ایک صحرا میں خیمہ زن تھا۔ کچھ اربابِ مذاق جو مدعو تھے شام کے بعد شعر خوانی فرمانے لگے۔ بہت سے استادوں کے کلام پڑھے گئے اور سب حضرات تلذّذ روحی اٹھاتے گئے ۔ آخر ایک طبیعت‌دار جوان رعنا نے یہ مقطع غالب کا پڑھا ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

یہ شعر غیر معروف نہ تھا مگر اس سے کچھ عجیب کیفیت قلبی پیدا ہوئی، اس وقت سے تا سحر اس دل‌گرفتہ کو سخت بےقراری لاحق رہی، فقیر کے دل سے اس دن کی نمازِ صبح کا مزا نہیں جاتا۔ کاش ایسی صبح دولت خیز ہر روز نصیب ہوتی ۔ واقعی جس کلام میں تاثیر نہ ہو وہ کلام گو ہزار صنائع بدائع سے بھرا ہوا ہو قابل نفرت ہے۔ اسی طرح ایک بار شب کو ایک دوست نے خواجہ میر دردؔ کے یہ دو شعر پڑھے ؎

یہی پیغام دردؔ کا کہنا جب صبا کوئے یار میں گزرے
کون سی رات آن ملیئے گا دن بہت انتظار میں گزرے

حالانکہ ان شعروں سے بھی عاجز کو سابق سے واقفیت حاصل تھی، مگر دل کا یہ عالم ہوا کہ خدایا تیری پناہ۔ وہ رات تو بری گزری مگر ایک ہفتہ تک وحشت کی کیفیت قائم رہی ۔ میر صاحب کے نشتروں کی کیفیتوں کو بیان کرنا فضول ہے، کون شخص ایسا ہے کہ جو دل رکھتا ہے اور ان کا زخم خوردہ نہیں ہے۔ المختصر غزل سرائی ایک ایسی شے ہے کہ جس کو محض دل سے تعلق ہے اور ظاہرا جیسی غالب کی غزل سرائی

نظر آتی ہے اس سے آن کا ایک بامراد غزل سرا ثابت ہونا بعید از انصاف نہیں ہے -

حضرت غالب کے کچھ وہ اشعار جن سے لطف غزلیت نہیں اُٹھتا نمونہ کے طور پر ذیل میں عرض کئےجاتے ہیں، مگر ایسے اشعار بہت نہیں ہیں سہ

شمار سبحہ مرغوب بُتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بےمہری قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
پۓ نذرِ کرم، تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوٰی پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست، رسوا بےوفائی کا
بمہرِ صد نظر ثابت ہے، دعوٰی پارسائی کا

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں غزلیت کا کوئی مزا نہیں ہے - ان سے پرتاثیری کی کیا اُمید کی جاتی ہے - اگر ایسے ایسے اشعار خارج از دیوان کر دیئے جائیں تو سوا فائدہ کے کوئی نقصان متصوّر نہیں ہے-

ختم الشعراء میرزا نوشہ*

ختم الشعرا میرزا نوشہ جن کی وفات دھلی میں ۱۸۶۹ء میں ہو گئی، عجیب پایہ کا شاعر گزرا ہے - اور جس نے سچ تو یوں ہے کہ شاعری کو دھلی میں ختم کر دیا - میرزا صاحب کے بعد اور بھی شاعر گزرے ہیں اور اس وقت ہندوستان میں موجود ہیں لیکن کسی خاص رنگ کے موجد نہیں ہوئے اور اگر ہماری واقفیت ناقص نہیں ہے تو اس زمانہ میں بھی کوئی ایسا نظر نہ آئیگا جو موجد ہو کسی خاص رنگ کا -

میرزا نوشہ یا غالب ایک عجیب و غریب دل و دماغ کے شاعر تھے - فارسی میں کل ایرانی شعراء سے انہوں نے نیا رنگ پیدا کیا تھا - شعر گوئی میں فردوسی کا تتبّع ہمیشہ ان کے زیر نظر رہا - جس طرح فردوسی فارسی نظم میں عربی الفاظ استعمال نہیں کرتا تھا - اسی طرح مرزا نوشہ بھی عربی الفاظ کا بہت کم استعمال کرتے تھے - اردو میں ہمارے ختم الشعراء نے خود عذر کیا ہے کہ اردو میں میرا رنگ پھیکا ہے لیکن فارسی میں مجھے پوری دستگاہ ہے - چنانچہ وہ خود کہتے ہیں ــــہ

فارسی بین تابہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

لیکن نہیں ہم میرزا نوشہ کے اس عذر اور کسر نفسی کو قبول نہیں کرتے - اُن کے اردو کے دیوان میں سے ان اشعار کو نکال کر جو ادق ہیں اور جن کے معنی سمجھنے میں دقت پڑتی ہے، اگر صاف اور ستھرے اردو کے اشعار چن لئے جائیں تو معلوم ہوگا کہ فاضل شاعر کس دل و دماغ کا شخص ہے اور جو رنگ اس نے اردو میں پیدا کیا ہے وہ بالکل

* چراغ دھلی (دسمبر ۱۹۰۳ء)

نیا رنگ ہے ۔ ہر شعر میں فلسفہ، جذباتِ فطری، انسانی پاس اور واقعات سے بحث ہے اور تعجب سے دیکھا جاتا ہے کہ میرزا نوشہ کی ذات میں یہ کل صفتیں خداوند تعالیٰ نے کس طرح ودیعت فرما دی تھیں ۔ درد جو شاعری کا جزوِ اعظم ہے اور انسانی فطرت اور نفسِ واقعات کی بحث ایک ایسی عجیب و غریب بحث ہے جس سے شعر میں جان پڑ جاتی ہے اور یہ ممکن نہیں کہ انسان ایک شعر کو پڑھے اور اس کے حواسِ خمسہ میں ایک سنسناہٹ نہ پیدا ہو جائے ۔ مثلاً میرزا نوشہ فرماتے ہیں:۔

وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

ایسے فطری واقعات ہر انسان کو اس کی زندگی میں واقع ہوتے رہتے ہیں ۔ جب وہ جبہ سائی کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو خود اس کا دل یہ گویا ہوتا ہے کہ جب اتنی مدت تک اس مقام سے کچھ حاصل نہ ہوا تو ایسی جبہ سائی کرنے کے لئے اور بھی در موجود ہیں ۔ جبہ سائی کا جب کوئی فائدہ نہ نکلا اور یہ مفت کی بیگار ہو گئی تو ایسی بیگار ہر جگہ ہو سکتی ہے ۔ اس سے زیادہ انتہائی مایوسی اور انتہائی درد کا جو لگا تار کوشش کی ناکامی پر حاصل ہوتا ہے عمدہ پیرایہ میں بیان نہیں ہو سکتا ۔ کوئی مبالغہ نہیں ۔ کوئی استعارہ نہیں ۔ کوئی خیالی بات نہیں ۔ انسانی فطرت، جذبات، محسوسات اور ناکامی کی ایک سچی تصویر اتاری گئی ہے اور یہ ایسی تصویر ہے جس کا جواب انسانی حادثاتِ طبعیہ میں نہیں ہو سکتا ۔ پھر میرزا نوشہ فرماتے ہیں:۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

اس دماغ کی تعریف نہیں ہو سکتی جس سے یہ شعر نکلا ہے ۔ شاعر اپنے دوست کو تسکین دیتا ہے کہ یہ نہ سمجھنا کہ میں نے ناراض ہو کے تم سے ملنا چھوڑ دیا ہے ۔ میں تو اب بھی ایک نگاہِ تلطف کا منتظر ہوں ۔ اگر مہربان ہو کے بلا لو گے بخوشی حاضر ہونے کو موجود

ہوں۔ مجھ میں وقت کی سی بے وفائی نہیں ہے کہ جانے کے بعد پھر آنے کا نام نہیں لیتا۔ دوسرے فاضل شاعر اپنے دوست کو خاص ایک تعلیم بھی کرتا ہے کہ وقت پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ ہاتھ سے نکلنے کے بعد پھر وقت کبھی واپس نہیں آ سکتا۔ جو کچھ کرنا ہے آج کر لو۔ آج کا کام کل پر اٹھا کے نہ رکھو۔ پھر عاشقانہ خیالی مضمون جو درد و یاس کا شاعر باندھا کرتے ہیں، اسے اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ جی پھڑک پھڑک جاتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ میرزا کا دماغ کس بلا کا تھا جس سے یہ اشعار نکلے تھے۔ چنانچہ عاشقانہ خیالی مضمون فرماتے ہیں؂

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجیھو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

یعنی میں رفوئے زخم اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ زخم اچھا ہو جائے اور خیال یہ کر لیا جائے کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے۔ بلکہ یہ رفو اس لئے کیا جاتا ہے کہ زخم میں جو سوئی آئے جائے گی اس کے چبھنے سے ایک خاص لذت آتی ہے۔ یہ باتیں ہیں تو خیالی جن کے پڑھنے سے قائل کی طباعی معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی انتہائے محبت ہے کہ اپنے دل کے زخموں کو رفو اس غرض سے کیا جاتا ہے کہ اور بھی تکلیف ہو ورنہ اور کوئی غرض نہیں ہے۔

میرزا نے اردو میں جدت پیدا کی تھی اور ابھی وہ زمانہ نہیں آیا تھا کہ میرزا کا یہ نو ایجاد رنگ قبول کر لیا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی زبان میں میرزا نے وہ مہارت اور مقبولیت پیدا کی تھی کہ ایرانی بھی عش عش کرتے تھے۔

صلاح الدین خدا بخش

غالب*

ادب قومی زندگی کا آئینہ ہے اور قومی زندگی مختلف اثرات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جن میں سے کچھ پر تو انسان کو قابو ہوتا ہے اور کچھ پر نہیں ہوتا۔ آب و ہوا، طبعی حالات، سیاسی آزادی یا غلامی کے اثرات، یہ اور ان کے علاوہ بہت سے دوسرے اثرات اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ توجہ میں آئے بغیر نہیں رہتے۔۔۔

مشرق میں مظاہر فطرت، سیاسی آزادی یا حسن کی پرستش وہی کیفیت حاصل نہیں کرتی جیسی مغرب میں۔ برخلاف اس کے انسان اور اس کا مقدر شاعر کی جدوجہد کا چہیتا موضوع رہا ہے۔ اس کی تمام قوتیں اس کا آرٹ اس کی ذہانت صرف اسی ایک موضوع پر مرکوز رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں وہ لطافت، تنوع اور وسعت نہیں پاتے جو ہمیں یورپی شاعری میں ملتی ہے اور اسی لئے اس میں جدت کا فقدان ہے جس کے بارے میں یورپی مصنف ہمیں طعنہ دیا کرتے ہیں، تاہم ہمارے شاعر اپنے اپنے حلقہ میں بلند پایہ اور عدیم المثال ہیں۔ مشرقی انسان اپنی طبعی سرشت کی وجہ سے پراسرار اور اداس، عمل کے بجائے خیالی اور قسمت پر شاکر ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس کا مذہب و عقیدہ قضا و قدر کی تعلیم دیتا ہے بلکہ وہ اپنی زندگی میں یہی دیکھتا ہے اور ماضی کے واقعات میں یہی سبق پڑھتا ہے کہ زندگی میں کوئی ثبات نہیں، وقتی وبائیں بیک جنبش، ہزارہا انسانی جانوں کو بہا لے جاتی

* "Ghalib : An Appreciation" (۱۹۱۲ء)
(اردو ترجمہ از ضیاء الدین احمد برنی، ماہ نو، کراچی، فروری ۱۹۵۷ء)

ھیں۔ بادشاھوں کا لاؤبالی مزاج آناً فاناً ان کے ھم جنسوں کو یا تو سربلند کر دیتا ھے یا ذلیل بنا دیتا ھے۔ ھر قدم پر انسانی کوششوں کی حماقت اور انسانی خواھشات کی بےاثری کا احساس ھوتا ھے۔ وہ زندگی کو جوا سمجھتا ھے یہی سبب ھے کہ ھماری شاعری کا نمایاں عنصر تسلیم و رضا، افسردگی اور توکل ھے۔ زندگی سے تنگ آنے کے بعد انسان اپنی افتادِ طبیعت کے خلاف تصوف سے دل بہلانے لگتا ھے۔ اسی لئے تصوف کا رنگ پیدا ھوتا ھے، اسی لئے گڑگڑا کر دعائیں مانگی جاتی ھیں۔ اسی لئے انسانی جدوجہد کے رائیگاں ھونے اور انسانی عزائم کی بےبسی پر ماتم کیا جاتا ھے۔ یہ ایوبی روح ھے جس سے بسااوقات ھم اپنی شاعری میں دوچار ھوتے ھیں، اس میں عمیق حزن اور گہری افسردگی کا پتہ ملتا ھے۔

زندگی سے بیزاری اور نفرت کا احساس، دنیوی خواھشوں اور خوشحالی کی دنیوی آرزوؤں کے قطعی کھوکھلا ھونے اور باری تعالیٰ کی نیکی اور انصاف پسندی کے خلاف بغاوت کا احساس اور افسردگی، حزن کی جانب مشرقی مصنفین کے قدرتی رجحان سے قطع نظر ایک اور سبب بھی تھا، ایک امدادی سبب جس نے ھندوستان میں اس رجحان کو گہرا کرنے اور اس پر زور دینے کا میلان پیدا کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کا ستارہ غروب ھو گیا تھا، مسلمانوں کی شان و شوکت اور عظمت ختم ھو چکی تھی۔ لہٰذا جو لوگ اس دور میں زندہ تھے اور لکھتے لکھاتے تھے، وہ بیچارگی، افسردگی اور بیزاری کے احساس کو مشکل سے دور کر سکے یا اس قسمت اور تقدیر کے خلاف جس نے انہیں مفتوح، مغلوب اور زخمی کر کے زمین پر پٹخ دیا تھا، انسانی امیدوں کے کھوکھلے پن اور کشمکش کی بیچارگی کے تخیل کا کامیابی سے بمشکل مقابلہ کر سکے۔

جو لوگ مایوسی اور حزن کی اس فضا میں پیدا ھوئے اور پلے بڑھے، دنیا ان کی نظروں میں ایک خشک، بےبرگ و گیاہ ویرانہ تھی اور زندگی ایک ناقابلِ برداشت بار۔ یہ محض شاعرانہ رجز نہ تھا جس نے سودا کو

بہ لکھنے پر اکسایا تھا ۔۔

میں ہوں طاؤس آتشبار کیسی ہی بہار آئے
نہ باصحرا سرے دارم نہ باگلزار سودائے
بہر سو میروم از خویش می جوشد تماشائے

اور نہ یہ محض تخیل کی پرواز تھی جس نے میر تقی سے ذیل کی مایوس کن رباعی لکھوائی ۔۔

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلت مختصر کہ جس کو کہتے ہیں عمر
مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

یا پھر ناسخ کا یہ شعر ۔۔

بےقدر کیا کلفت ایام نے مجھ کو
گوہر تو ہوں لیکن ہوں نہاں گرد کی تہ میں

نہیں ، ان کی زندگیاں ایک زبردست المیہ جلوس تھیں اور یہ افسردہ غمگین نظمیں ان کی باطنی زندگی کا اظہار و انکشاف تھے ۔ ان کی طوفانی فطرت کی گہرائیوں میں ایک کشمکش، ایک بےصبری، ایک بےچینی، ایک افسردگی تھی جو آخر دم تک قائم و برقرار رہتی ہے اور ایک گہرے حزن کا نقش چھوڑ جاتی ہے ۔ میر حسن کی مثنوی میں بھی باوجود اس کی روشنی اور سایہ کے، اس کے پرمسرت، مزاحیہ خدوخال کے، افسردگی کا ایک گہرا دھارا بہتا ہے جسے ایک صاحب فکر قاری نظرانداز نہیں کر سکتا ۔ حزن و افسردگی کا یہی احساس ہے جو انیس اور دبیر میں بلند انداز میں جلوہ گر ہوا ہے ۔ اس فضا نے جو سر تا سر حزن و افسردگی کے جذبہ سے سرشار تھی، ہمارے اہل قلم کے خیالات و جذبات کو بہت بڑی حد تک متاثر کیا ہے ۔ وہ ایک ہی لمحہ میں پریشانی سے مسرت تک جا پہنچتے ہیں اور پھر مسرت سے زیادہ گہری پریشانی کی طرف لوٹ

آتے ھیں ۔ یہ کسی مردم بیزار شخص کی مکروہ اور نفرت انگیز اداسی اور افسردگی نہیں ھے، بلکہ ایک ایسی فطرت کا پاکیزہ دبا ھوا غم ھے جس میں کشمکش اور بغاوت ختم ھو چکی ھو اور جو مسرت بخش رضامندی کے ساتھ قدرت کے اٹل اور ناقابل تنسیخ فیصلہ کو تسلیم کرتی ھو۔ یہ شاپنہار کا حزن نہیں بلکہ اسے ھائن کا حزن قرار دینا چاھیے ۔

ایک شاعر کے مقاصد اور فرائض کیا ھیں ؟ کیا ھمارے شاعر وہ مقاصد اور فرائض پورا کرتے ھیں؟ وہ کیا چیز ھے جو سچے شاعر کو لافانی بنا دیتی ھے؟ وہ کیا بات ھے جو اس کی تصنیف کو جاوداں بناتی ھے اور وقت اور تقدیر کے انقلابات اور عارضی طور و طریق اور رسم و رواج کی پائمال راھوں سے نکال کر باھر لے جاتی ھے؟ وہ کیا راز ھے جو اس کی تصنیفات کو نہ کم ھونے والا نکھار اور لازوال حسن عطا کرتا ھے؟ . . .

شاعری انسانی مسرتوں، دکھوں اور تکلیفوں کے ساتھ ھمدردی ھے اور ان جذبات کو ظاھر کرنے کی طاقت ھے جسے اگرچہ سب محسوس تو کرتے ھیں، لیکن سب اس کے اظہار کی طاقت نہیں رکھتے۔ ان نازک ترین احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کی قابلیت ھمیں فطرت دیتی ھے ۔ یہی وہ صفات ھیں جو ایک شاعر کو بیک وقت واعظ اور پیغمبر بنا دیتی ھیں۔ شاعری مادی فطرت کی بیرونی دنیا اور جذباتی انسان کی اندرونی دنیا دونوں کی ترجمانی کرتی ھے ۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ھے کہ شاعری بیرونی دنیا کے خصوصی حالات اور حرکات و سکنات کی ساحرانہ لطف بیان کے ساتھ تشریح کرتی ھے اور وہ انسان کی اخلاقی اور روحانی فطرت کی اندرونی دنیا کے خیالات اور قوانین کی الہامی یقین کے ساتھ ترجمانی کرتی ھے ۔ بالفاظ دیگر شاعری اپنے اندر قدرتی سحر اور اخلاقی گہرائی جیسی چیزیں رکھتی ھے۔ وہ دونوں طریقوں سے انسان کی ترجمانی کرتی ھے اور اسے حقیقت کا مطمئن کرنے والا جذبہ عطا کرتی ھے، وہ اسے اس قابل بناتی ھے

کہ وہ اپنے اور کائنات کے ساتھ ہم‌آہنگ ہو جائے۔

شاعر انسان کے مستقل اور ابدی جذبات سے اپیل کرتا ہے، جذبات جو وقت اور حالات کی تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتے، جذبات جو نسل اور مذہب کی رکاوٹوں کے باوجود تمام بنی نوع انسان میں مشترک ہیں۔ زبان ترقی‌پذیر ہوتی ہے، مذہب بدلتا ہے، خدا تعالیٰ کا تصور زمانہ بہ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ لیکن معاشی زندگی اور معاشی رواجوں کی نہ ختم ہونے والی تبدیلیوں، جدّتوں، اختلافوں میں انسانی علم کے ذخیرہ میں لامتناھی اضافوں اور تفریقوں میں انسانی فطرت ہے کہ یکساں رہتی ہے۔ دکھ کا، تکلیف کا، زندگی کا، موت کا معمہ، مایوس امیدوں یا ناکام محبت سے پیدا ہونے والی بےچینی و کرب، قسمت اور مقدر کے خلاف کی جانے والی ناکامیاب جنگ، یہ ہیں وہ موضوعات جو ہمیشہ مسرت پیدا کریں گے، دلوں کو فریفتہ کریں گے، ان میں روح پھونکیں گے اور لوگوں کو ان کے مردہ نفوس سے زیادہ بلند مقامات پر لے جائیں گے۔ خوشی کی شاعری، دکھ درد کی شاعری انسانی دل میں تاثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ خوش‌بختی پرمسرت ہے اور بدبختی کی تسکین۔

"بیٹا! زندگی ایسی ہی ہے، ایک مستقل شیون، ایک مستقل جدائی، ایک مستقل علیحدگی۔" کس قدر بردرد حقیقت اور ساتھ ہی کس‌قدر سچی، کس‌قدر اثرآفرین، یہ وہ میسحائی ہے جو زندگی کے سرچشمہ سے حاصل کی گئی ہے۔ لیکن کیا ہائن کی طرح صائب نے وہی بات نہیں کہی!

طومار درد و داغ عزیزان رفتہ است
این مہلتے کہ عمر دراز است نام او

اس لطافت، تازگی اور دل‌آویزی کا راز جو سچا شاعر اپنے اندر رکھتا ہے، اس ابدیت کا راز جو انحطاط اور موت پر حقارت سے ہنستا ہے۔ شاعر کے احساس کی ہمہ گیری ہے، اس کے جذبات کی عمومیت

"Das ist das Leben, Kind! Ein Ewig Jammern, Ein Ewig-, Abschiednehmen, Ew'ges Trennen!" (Heine)

ہے، زندگی کے مستقل عناصر پر اس کی مضبوط گرفت ہے ۔ اگرچہ ہماری اپنی ہندوستانی شاعری ایرانی شاعری کے نمونہ پر ڈھالی گئی ہے تاہم وہ نہ تو اس کی غلامانہ نقل ہے، نہ اس کا بیجان ترجمہ ھی ہے ۔ ممکن ہے خیالات یکساں ہوں لیکن اس کا طریقۂ اظہار طبع زاد، موثر اور دلفریب ہے ۔ کون ہے جو میر تقی، مومن، ذوق، آتش، ناسخ اور (سب سے آخر مگر بلحاظ اہمیت کسی سے کم نہیں) غالب کے کلام میں ایک ماہر فن کی خصوصی مہارت اور سچے شاعر کا اختراعی کمال محسوس کئے بغیر رہ سکے ۔ ان کی لطافت اور متانت، ان کی بلند پروازی اور رفعت، ان کے قہقہے اور آنسو، اس قدر نازک، اس قدر پاکیزہ ہیں کہ الفاظ میں نہیں سما سکتے یا کوشش کرنے پر بھی الفاظ کا جامہ نہیں پہن سکتے ۔ وہ ذہنی دیوتاؤں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں دنیا لافانی کے نام سے یاد کرتی ہے ۔

. . . غالب کی غیر معمولی شاعری بلاشبہ اس سے زیادہ شہرت کی حقدار ہے جو اسے اب تک نصیب ہو چکی ہے اور یورپ کو بھی یہ جاننا باقی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ۱۸۶۹ء میں ایک ایسے شخص نے انتقال کیا جس کے قصیدے انوری اور خاقانی کے ہم پلہ ہیں ۔ جس کی غزلیں عرفی اور طالب کی غزلوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں ۔ جس کی رباعیاں عمر خیام کی رباعیوں کے برابر رکھنے کے قابل ہیں اور جس کی نثر ابوالفضل اور ظہوری کی نثر سے زیادہ شاندار ہے ۔۲

آخر ہمارے شاعر کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟ اس کی نثر اور شاعری، خودنوشت سوانح عمری کے ایسے ٹکڑے ہیں جن سے ہمیں اس کی زندگی کے بارے میں بصیرت حاصل ہوتی ہے، جو سراسر بیزاری اور شدید کشمکش کی زندگی تھی ۔ جہاں تک اس کے معاصرین کا تعلق ہے ان کی زندگی تکلیف دہ بے اعتنائی کی زندگی تھی اور جہاں تک اس کے دوستوں کا تعلق ہے ان کی امداد میں کم التفاتی کا جذبہ کارفرما تھا ۔ غالب لازماً خودشناسی کا شاعر ہے ۔ وہ زندگی اور زندگی کے جملہ پہلوؤں کا

۲ ۔ حالی: یادگار غالب، صفحہ ۱۶۸ ۔

گیت گاتا ہے - وہ بادۂ ارغوانی اور جام کے گیت گاتا ہے - وہ اپنے دل کو اپنے قارئین کے سامنے چیر کر رکھ دیتا ہے - اور خود اپنی زندگی کی تلخیوں، اپنی قسمت کی کوتاہیوں، اپنی سراب‌نما امیدوں (جو کبھی پوری نہیں ہوتیں)، اپنی عذاب میں ڈالنے والی فلاکتوں، اپنی ناکام کوششوں، اپنے شبہات جن میں کبھی کبھی خدا تعالٰی کی نیکی اور انصاف‌پسندی کے مسرت‌بخش اعتقاد کی جھلک نمایاں ہو جاتی ہے، اپنی شاعری کے لافانی ہونے پر ناقابل تسخیر اعتقاد کے نغمے گاتا ہے - الغرض اس کی نثر اور شاعری اس کے مختلف اور تغیر پذیر حالات کی یادداشتیں ہیں - اس میں کبھی پرمسرت توقع کی کیفیت پائی جاتی ہے اور کبھی ایسی تیرگی کی جس کی تھاہ نہیں ملتی -

غالب اعلٰی درجہ کا شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اعلٰی درجہ کا نثار بھی ہے - وہ ہمارے دور کا سب سے بڑا نثرنگار ہے، اتنا بڑا کہ اس کا کوئی مدّمقابل نہیں - اس کی دلفریب لطافت، اس کی مسرت‌بخش سادگی، اس کی نکتہ‌سنجی اور ظرافت، اس کی دلکش روانی، اس کا ہلکا پھلکا اندازبیان، اس کی بےساختگی اور دل‌ربائی، یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے سبقت لے جانے والا تو کیا حریف بھی پیدا نہیں ہوا - یہ مبالغہ آمیز تعریف نہیں ہے بلکہ وہ ممتاز رائے ہے جو اس کے ممتاز سوانح نگار حالی پانی پتی نے قائم کی ہے - اس کے علاوہ غالب کے کلام کا ایک اور پہلو ہے جس پر ہم یہاں اظہار خیال کر سکتے ہیں - اس کے خیالات نہایت بلند، دقیق اور نازک ہیں اور وہ اتنے ہی خودرو ہیں جتنے کہ وہ الفاظ حسین ہیں جن میں ان کو ادا کیا گیا ہے - اس کے اردو اور فارسی دیوان ادبی جواہرات ہیں، دودھیا پتھر، یاقوت رمّانی اور نیلم، سب ایک مرکب کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں - وہ موحد تھا جس نے بہت عرصہ پہلے مذہب کے غیر ضروری عناصر سے علیحدگی اختیار کر لی تھی - اس نے کوئی فرقہ وارانہ نشان نہیں لگایا - وہ اسلام کا قائل تھا ایسا اسلام جو کٹرپن، فرقہ‌بندی اور تنگ‌خیالی سے آزاد، معرّا اور مبرّا تھا -

- بامن میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
هر کس که شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد

اس شعر سے ہمیں اس کی بےباک آزادیٔ خیال کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتا ہے ''میں ایک خالص موحد اور سچا مسلمان ہوں ۔'' اور وہ تھا بھی درحقیقت ایسا ہی ۔ یہی وہ روح تھی جس نے اسے دوسرے مذاہب کے بارے میں اس قدر غیر معمولی طور پر فیاض، روادار، ہمدرد بنا دیا تھا اور جس نے اس سے یہ کہلوایا —

حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواھد گرفت
دستگاہ ناز شیخ و برہمن خواھد شدن

یہ وہ پہلو ہے جو اتنا ہی نمایاں اور قابل اعتنا ہے جتنی کہ رائے عامہ کے لئے اس کی مسلمہ حقارت ۔ اگرچہ غالب ایک ایسے دور میں اور ایسے لوگوں میں رہا جو بہ‌حیثیت مجموعی نہ تو فاضل تھے اور نہ قابلیت کے پرکھنے والے ہی تھے ۔ ہندوستان میں اسلامی علم و فضل کا سنہری دور مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا ۔ تاہم بلاشبہ ایسے آدمی بھی موجود تھے، معدودے چند لیکن وہ لوگ تھے زندہ، اور اس کے ہم‌عصر جنہوں نے اس کی اعلیٰ قابلیتوں کو تسلیم کیا تھا اور اس کی ذہنی برتری کو مانا تھا ۔ یہ تھے فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین خان، عبداللہ خان علوی، امام بخش صہبائی، مومن خان، نواب مصطفٰی خان، نواب ضیاءالدین، سیّد غلام علی خان، وحشت اور حالی جو اس کے سوانح نگار ہیں ۔ ان کے علاوہ بہادر شاہ اور نواب رامپور تھے جو انہیں مالی امداد دیتے رہتے تھے۔ اگرچہ ہمیں اقرار کرنا چاہیے کہ وہ اتنی زیادہ نہ تھی کہ اس کا ذکر کیا جائے ۔ اپنی زندگی میں غالب ایسا شخص نہ تھا کہ اس کے کمال کا بالکل اعتراف نہ کیا گیا ہو، لیکن وہ اعتراف ایسا تھا جو بدیہی طور پر اس کی خداداد قابلیتوں کے مطابق نہ تھا ۔ قسمت ادیبوں پر غیر معمولی

طریقه سے کبھی مہربان نہیں رہی، اور اس بارے میں غالب عام کلیه سے مستثنٰی نہ تھا - جس چیز کا احساس اور اظہار غالب نے کیا ھے کونسے غیر معمولی ذھانت اور قابلیت رکھنے والے شخص نے اسے محسوس نہیں کیا؟ کونسا غیر معمولی ذھین شخص ھے جس نے اعتراف قابلیت کے لئے اپیل نہیں کی اور اپیل کی بھی ھے تو اس میں اسے ناکامی ہوئی، جسے اس کے معاصرین نے صرف تھڑدلی اور بخل کے ساتھ قبول کیا ھے؟ کیا صائب نے نہیں کہا ھے؟

بی‌اجل یادِ کسی خلق به نیکی نه کند
مرگ این طائفه را برسر انصاف آرد

نہ غرور نہ خودبینی بلکہ اپنی شہرت کا یقین اور دوام ھی وہ چیز ھے جس کا اظہار ذیل کے شعر میں کیا گیا ھے، دھیما، لڑکھڑاتا ہوا نہیں بلکہ مضبوط، یقینی اور واضح :-

تا ز دیوانم که سر مست سخن خواهد شدن
این می از قحط خریداری کهن خواهد شدن
کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بوده است
شهرتِ شعرم بگیتی بعد من خواهد شدن

اس میں الہام کا رنگ ھے، ایک پیش گوئی، جو حرف بحرف پوری ہوئی - کیا اچھا ہوتا اگر وہ شاعر ھائن کے بلند ابیات کا اطلاق اپنے اوپر کرتا :

''تمہارا دل سمندر کی طرح ھے،
جس میں طوفان اور مد و جزر ھے،
اور گوناگوں وضع کے خوبصورت موتی
اس کی تہ میں پڑے ہوئے ہیں۔،،

اور صحیح معنوں میں ہم اس کے دل کو سمندر سے تشبیہہ دے سکتے ھیں جو اپنے طوفان، اپنے مد، اپنے جزر کے باوجود، اپنی متلاطم سطح کے باوجود، اپنے نیچے نہایت پسندیدہ اور خوبصورت ترین موتی

رکھتا ہے ۔ کاش ہمیں مختلف غزلوں اور نظموں کی تاریخوں کا علم ہوتا، وہ ہمیں اس قابل بنا دیتیں کہ ہم ان کی مدد سے ایک سوانح عمری مرتب کر لیتے، لیکن ہم اس فقدان پر خواہ کتنا ہی ماتم کریں سوانح عمری کے لئے ہمارے پاس مواد کی کمی نہیں ہے ۔ خود اس کے خطوط، حالی کی سوانح عمری، وہ حالات جو آزاد نے اپنے تذکرہ میں لکھے ہیں، ایسی چیزیں ہیں جو سوانح نگار کو کام کرنے کے لئے کافی مواد بہم پہنچاتی ہیں ۔ مگر اس کے سوانح نگار کا مقصد محض یہ نہ ہونا چاہئے کہ وہ اس کی زندگی کے واقعات قلمبند کر دے، بلکہ اسے یہ دکھانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ کہاں تک اور کس حد تک وہ خود اپنے دور کی پیداوار اور آنے والے دور کا نقیب تھا، نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر کے شعرا میں بھی اس کے درجہ پر غور کرنا چاہیے، اس کا اندازہ لگانا چاہیے اور اسے متعین کرنا چاہیے ۔ یہ ابھی تک بن جتی زمین ہے اور ایسا کھیت جس میں کھدائی نہیں ہوئی اور صرف اسی لئے یہ ایسا موضوع ہے جس پر تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے، ایک ایسا مطمع نظر ہے جس کے حصول کے لئے کوشش مفید نتائج پیدا کرے گی ۔ اس غیرفانی نام کی چمک میں اضافہ ہوتا رہے گا ۔ جوں جوں تعلیم بڑھتی جائے گی واردات قلب کے اس عجیب و غریب مجموعے یعنی ''دیوان مرزا اسداللہ خاں'' کی قدردانی ترقی کرتی رہے گی ۔

پیارے لال شاکر میرٹھی

مرزا غالب دہلوی کی شاعرانہ عظمت*

غالب کی شاعری کی عظمت کا اندازہ کچھ وہی لوگ بورے طور پر کر سکتے ہیں جنھیں مبدء فیاض سے ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح کا معتدبہ حصّہ ملا ہے۔ ایسے بابرکت نفوس میں فطرتی طریقے سے وہ تمام قوتیں موجود ہوتی ہیں جن کی امداد سے وہ اپنی کوششوں کو کارآمد اور ضروریات کے عین مطابق بنا سکتے ہیں۔ غالب کے زمانہ تک اردو شاعری ایک ڈھرے پر چلی آ رہی تھی اور اس میں جدّت کا پہلو تقریباً مفقود ہو چکا تھا۔ جو راگ صدیوں سے الاپے جا رہے تھے، انہیں سنتے سنتے سامعین کی بے لطفی بیزاری تک پہنچ چکی تھی۔ ایک ہی لقمہ تھا کہ ہزاروں منہ میں چبایا جا چکا تھا۔ اس میں وہ ذائقہ مطلق باقی نہ تھا جس سے دماغ اور روح کو کوئی مسرت پہنچ سکے۔ غالب کی دوربین نظروں نے اس نقص کو شاید پہلے ہی دریافت کر لیا تھا اور انہیں عامیانہ طرز سخن کی تقلید کی زنجیر توڑ ڈالنے کی ضرورت ابتدا ہی میں محسوس ہو چکی تھی۔ اس لئے انہیں اپنے لئے ایک جداگانہ راستہ تلاش کرنا پڑا۔ پرانی لیک کا چھوڑنا کوئی آسان بات نہ تھی اور اس کام میں انہیں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بایں ہمہ ان کی معنی آفرین طبیعت اور ذہن رسا نے ان کے لئے بالآخر ایک ایسی شاہراہ پیدا کر دی جسے مولانا حالی تو پرانے راستہ کے متوازی سمجھتے ہیں، لیکن ہم اپنی ناچیز رائے کے مطابق اسے صراط مستقیم خیال کرتے ہیں۔

اصلاح کے معنی، ہماری سمجھ کے مطابق یہ ہیں کہ کسی چیز کے نقائص و عیوب کو دور کر کے اس کی ضرورت کے مطابق خوبیوں کو

* ادیب، الہ آباد (جولائی، ستمبر ۱۹۱۲ء)

جمع کر دیا جائے، نہ یہ کہ چیز کی اصلی ہیئت ھی نہ باقی رہے ۔ آخرالذکر صورت اصلاح نہیں بلکہ ایجاد کہی جا سکتی ہے۔ ہم غالب کو اردو شاعری کا موجد تسلیم نہیں کرتے، بلکہ مصلح یا ریفارمر، اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی قدیم خصوصیات قائم رکھنے کے ساتھ ھی اس میں وہ تغیّرات پیدا کر دئیے ھیں جو کسی شے کی درستی اور اصلاح میں ظہور پذیر ہونا لابدی ھیں ۔

غالب کو سب سے بڑی دقت جو اپنے مشن کی کامیابی میں پیش آئی ہوگی، وہ عوام الناس کی مخالفت ہوگی ۔ لوگوں کا مذاق شروع سے بگڑا ہوا تھا اور وہ حسن و عشق کے ان سوقیانہ جذبات سے لذت پذیر ہونے کے عادی بنے ہوئے تھے، جنھوں نے اردو شاعری کی بدنامی میں آج تک بڑا حصہ لیا ہے۔ ہماری رائے میں عاشقانہ شاعری بشرطیکہ طرزِ اداے مطالب میں اعتدال مدِّ نظر رہے کوئی بری چیز نہیں بلکہ اس سے وہ سچی اور قدرتی کیفیتیں مترشح ہوتی ھیں جن سے متاثر ہونے سے قلوبِ انسانی کو چارہ نہیں، لیکن شریفانہ طرز بیان کی جگہ جب بازاری زبان میں عشق و محبت کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو وہ نہایت ذلیل و مکروہ چیز ہو جاتی ہے ۔ مثنوی مولانا روم میں آپ عشق کی موثر شبیہہ دیکھ کر ذرا جان صاحب کے دیوان پر نظر ڈالئے تو پاک جذبات اور ناپاک ترین خواہشات کا فرق بین دریافت ہو سکتا ہے ۔ نیز موخرالذکر سے ہمارے خیالات کی پستی اور ہماری معاشرتی خرابی کا صحیح اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔

غالب نے جب آنکھ کھول کر دیکھا ہو گا تو انھیں اپنا ہم خیال شاید ھی کوئی نظر آیا ہو اور پھر جب بے یارو مددگار انھوں نے اپنا کام شروع کیا ہو گا تو نہ معلوم کس کس قسم کی مخالفت کے طوفان سے مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ بعض تذکروں میں اب تک ایسے واقعات کا ذکر موجود ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفوں نے کس کس طریقے سے غالب کی چلتی گاڑی میں روڑے اٹکانے کی فکریں کی ھیں ۔ لیکن مشاھیر

کا خاصۂ طبیعت ھی ایسا ھوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اپنے ارادہ میں سدّراہ نہیں سمجھتے اور جس بات کو وہ غور و فکر کے بعد اچھا سمجھ لیتے ھیں اس کی دھن سے پھر ھاتھ نہیں اٹھاتے ۔ غالب بھی دھن کے پکے تھے، ورنہ ان کی کوششیں عام مذاق کی خرابی کا انسداد بدقت کر سکتیں ۔ بہر کیف غالب کامیاب رہے اور عزم و استقلال کے ھاتھوں انھوں نے تاریخ اردو میں عظمت و شہرت کے وہ پائدار نقوش چھوڑے ھیں جو ھمیشہ اپنی ضوفشانی سے ان کا نام چمکاتے رھیں گے اور آنے والی نسلوں کو ان کے زریں کارناموں سے باخبر کرتے رھیں گے ۔ کامیابی کی یہ مثالیں اور الوالعزمی کی یہ نظیریں صرف انھیں لوگوں میں پائی جاتی ھیں جن کو قدرت کی طرف سے اعلیٰ اوصاف دماغی و ذھنی ودیعت کئے جاتے ھیں اور اس سے ثابت ھوتا ہے کہ غالب کے دماغ و ذھن میں بھی فطرتاً وہ باتیں موجود تھیں جن کے بغیر انسان کے لئے مقصدوری کی منزل پر پہنچنا مشکل اور امر محال ھوتا ہے ۔

جب ھم غالب کی ابتدائی اور بے اصول تعلیم کا خیال کرتے ھیں اور پھر ان کی طبع رسا کی جودت اور فکر عالی کی رفعت کا اندازہ کرتے ھیں تو کامل یقین ھو جاتا ہے کہ بلا شبہ وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ھوئے تھے ۔ گیارہ برس کی عمر ھی سے وہ شعر کہنے لگے تھے اور اس کا اعتراف اس نامور شاعر نے خود اپنے فارسی دیوان کے خاتمہ پر کیا ہے ۔ بلکہ اگر غالب کے ایک ھم عمر، لالہ کنہیا لال صاحب کے بیان پر اعتبار کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ شاعری کا سلسلہ آٹھ نو برس کی عمر ھی سے شروع ھوگیا تھا، جب کہ غالب نے ایک مثنوی ''پتنگ بازی،، کے متعلق لکھی تھی اور اسے اس شعر پر ختم کیا تھا ؎

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ھر جا کہ خاطر خواہ اوست

غالب کے بچپن میں تعلیم کا جو معیار مقرر تھا وہ آجکل رائج

نہیں ۔ وہ خواہ مکمل رہا ہو یا نہیں لیکن اس کے کارآمد و مفید ہونے میں شک نہیں ۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ غالب کو قدیم طریقے کی پابندی کے باوجود بھی عربی کی تعلیم نہیں دلائی گئی ۔ صرف و نحو کی معمولی ابتدائی کتابیں البتہ نظر سے گزر گئی تھیں ۔ فارسی تعلیم خواہ کسی درجہ تک ہوئی ہو لیکن اس میں کلام نہیں کہ غالب کی فارسی زبان کی لیاقت اجتہادی رتبہ کی تھی اور ہندوستان میں فارسی کا ماہر لسان امیر خسرو اور فیضی کے بعد غالب کے پایہ کا شاید ہی نظر آئے ۔ فارسی النسل ہونے کی وجہ سے انہیں اس کا اکتساب یوں بھی آسان تھا، لیکن حسن اتفاق سے انہیں استاد بھی ایک پارسی نژاد ملا جس کی تاثیر تربیت نے غالب کو کچھ کا کچھ کر دیا ۔ انہیں فارسی زبان پر جو عبور اور قدرت حاصل تھی اس کا ایک شمہ ان کے فارسی کلام سے ظاہر ہو سکتا ہے ۔ الفاظ کا استعمال، محاورات کی صحت، زباندانی وغیرہ امور کے لحاظ سے وہ فارسی کے بہترین ادیب اور مستند ماہر کہے جا سکتے ہیں اور اسی دستگاہ کی جھلک ان کے اردو کلام میں بھی موجود ہے، خصوصاً ان کا ابتدائی اردو کلام جسے دیکھ کر اکثر مخالفین نے مہمل کہہ دینے میں بھی تامل نہیں کیا ۔

غالب کا مروجہ دیوان ریختہ اصلاح شدہ حالت میں ہے ۔ مولوی فضل حق صاحب خیر آبادی کی رائے سے اس میں سے ادق اور بعید از فہم اشعار حذف کر دئیے گئے ہیں ۔ اس وجہ سے ان کے وہ اشعار اس میں شاذ و نادر ملتے ہیں جنہیں ظریف طبع اشخاص بےمعنی خیال کرتے تھے ۔ تاہم نمونۃً دو چار شعر موجود ہیں جو دقت پسندی کا بجائے خود کامل ثبوت ہیں ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ہوائے سیر گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ انداز بخوں غلطیدن بسمل پسند آیا

رنگ شکستہ صبح بہار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتن گلہائے ناز کا

پہلا شعر جو اردو دیوان کا سر مطلع بھی ہے، معنی کے اعتبار سے، علمی حلقوں میں آج تک ما بہ النزاع ہے۔ اسی قسم کے ادق کلام کو دیکھ کر کسی نے یہ طعن آمیز شعر کہا ہے ؎

کلام میر سمجھے، اور بیانِ میرزا سمجھے
مگر انکا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مخالفوں کے طعن و تشنیع کا جواب اگرچہ غالب نے اس شعر میں نہایت خوبی سے دیا ہے اور سچ یہ ہے کہ اہلِ کمال اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں ؎

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن اس استغنا کے باوجود بھی انہیں اپنی روش کی اصلاح کرنی پڑی، کسی مجبوری سے نہیں بلکہ بطیب خاطر۔ چنانچہ درمیانی عمر کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثقیل الفاظ کی کثرت اور مطلب کی پیچیدگی تقریباً مفقود ہو گئی ہے۔ فارسی ترکیبیں اور محاورات چونکہ زبان پر چڑھے ہوئے تھے اس لئے انکا ترک یکایک فی الجملہ دشوار تھا، لیکن اس باب میں جب وہ اعتدال سے کام لے کر کچھ کہتے ہیں تو نہایت لطیف معلوم ہوتا ہے اور جب یہ ترکیبیں اضافات مسلسل کے ساتھ

آتی ہیں تو عجیب مزیدار چیز ہو جاتی ہیں ۔ اردو میں یہ رنگ خاص غالب کا ہے، اور اگرچہ اس زمانہ میں اس کے مقلد کئی پیدا ہو گئے ہیں لیکن اس کی نظیر از منۂ گذشتہ میں نہیں ملتی ۔ کہتے ہیں ۔

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

سرشکِ سر بصحرا دادہ نورالعینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد
کام یاروں کا بہ قدرِ لب و دنداں نکلا

ہے نو آموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں
پہلوِ اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

عشرتِ قتل گہہِ اہلِ تمنّا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنّا کھانا
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا

نظر بندی کے مضامین سے، جو زیادہ تر فارسی کے مشہور شاعر عبدالقادر بیدل کی تقلید کا نتیجہ ہیں، اگر قطع نظر کر کے دیکھئے تو ان کے دیوان کے صفحے ایسے اشعار سے بھرے پڑے ہیں جو طرزِ بیان، اسلوب‌بندش، صفائی مضمون، اور پاکیزگیٔ خیال کا بہترین مرقع ہیں۔ اس قسم کے اشعار سے ان کی طبیعت کا اصلی رنگ معلوم ہوتا ہے اور آمد کی شان ظاہر ہوتی ہے :۔

ہم رشک کو بھی اپنے گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، ولے اس کی تمنا نہیں کرتے
یہ باعثِ نومیدیٔ ارباب ہوس ہے
غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے، کیا کہئے
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے کیا کہئے
یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھ دیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے
وائے! واں بھی شور محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ہے
حوران خُلد میں تری صورت مگر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنون نے کیا کیا
فرصت کشا کشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں
نیند اسکی ہے، دماغ اسکا ہے، راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں
واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

تصوف کا رنگ، جو مشرقی شاعری کا جزو اعظم ہے، غالب کے کلام میں بھی بہت چوکھا ہے۔ مذہبی حیثیت سے چونکہ وہ بہت وسیع نظر رکھتے تھے اور خود اپنے ہی بیان کے اعتبار سے موحد بھی تھے، اس لئے اس میدان میں بھی ان کا سمندِ فکر کوسوں دور نکل جاتا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

صفائی زبان پر رجحان پیدا کرنے کے بعد سلامت پسندی کا ملکہ بھی بڑھتا گیا ۔ بعض بعض غزلیں ایسی صاف و شستہ زبان میں کہی گئی ہیں کہ باید و شاید ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل کمال ہر چیز کو اپنا بنا سکتے ہیں ۔ اردو شعراء میں سادہ گوئی کی مثال میر کے کلام سے زیادہ کہیں اور نہیں مل سکتی، لیکن ان کے بعد غالب کا نمبر ہے اور سلاست زبان و روانیٔ مطالب کے ساتھ اگر ان کی نازک خیالی کو بھی شریک کر لیا جائے تو میر سے غالب کئی درجہ بڑھ جاتے ہیں ۔ دیکھئے کس انداز سے فرماتے ہیں اور کلام کے ربط و تسلسل میں سرمو فرق نہیں آتا ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیمکش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
یہ مسائل تصوف، یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

درد منت کش دوا نہ ہوا میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
جمع کرتے ہیں کیوں رقیبوں کو اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی، اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

کوئی دن گر زندگانی اور ہے   اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں   سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے
دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر   کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے   نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی   اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد   پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں   ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کب وہ سنتا ہے کہانی میری   اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ   دیکھ خونابہ فشانی میری
چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے   یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید   نا امیدی اس کی دیکھا چاہیئے

بعض غزلوں میں قطعہ بند کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور وہ مجموعی حیثیت سے دلکشی و دلفریبی میں بجائے خود، عدیم النظیر ہیں۔ پاکیزگیٔ خیالات اور طرزِ بیان کی خوبی نے مل کر عجیب کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اس قبیل کی غزلیں اردو میں رائج نہیں اور غالب کے دیوان بھر میں دو تین سے زیادہ نہیں۔ ایک غزل مسلسل ہے سہ

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا! کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں   غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے نگہ چشمِ سُرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

اسی طرح ایک دوسری غزل ہے ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کئے ہوئے
اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

اس کو حسنِ عقیدت کہو یا امرِ واقعی! کلامِ غالب کے مطالعہ سے دماغ اور روح کو تقویت اور مسرت کا سامان بہم پہنچتا ہے، اور اس کا صحیح اندازہ کسی انتخاب سے نہیں ہو سکتا۔ سچ یہ ہے کہ غالب ایسا قادر الکلام اور رنگیں بیان شاعر، جو معجز نگاری میں بھی فرد ہو، ہندوستان میں آج تک پیدا نہیں ہوا اور گو غالب کے پیشروؤں اور ہمعصروں میں بہت سے مشاہیر، بعض بعض خصوصیات میں ان سے کسی طرح کم نہ تھے، لیکن بہ حیثیت مجموعی ان کا کوئی مدمقابل آج تک نہیں ہو سکا۔

ذوق مرحوم بھی اساتذۂ اردو میں بہت جلیل القدر سمجھے جاتے ہیں اور وہ غالب کے ہمعصر بھی تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا استاد ہونے کی

حیثیت سے بظاھر ان کی عزت اور وقعت غالب سے کچھ زیادہ ھی تھی ۔ ذوق کے پختہ کار اور نازک خیال شاعر ھونے میں شبہ نہیں، لیکن غالب کو وہ کسی طرح نہیں پہنچتے ۔ انھوں نے جو سہرا غالب کے سہرے کے جواب میں بایمائے بہادر شاہ لکھا اپنی جگہ بہت اچھا ھے، لیکن انصاف پسند طبیعتیں اسے غالب کے سہرے پر کبھی ترجیح نہیں دے سکتیں ۔ اسی طرح غالب اور ذوق کی اکثر غزلیں ھم طرح ھیں اور ان کے دیکھنے سے دونوں کا فرق دریافت ھو سکتا ھے ۔ ذوق کا مطلع ھے سہ

ہزار لطف ھیں جو ھر ستم میں جاں کے لئے
ستم شریک ھوا کون آسماں کے لئے

شعر بہت اچھا ھے، لیکن اسی قافیہ اور قریب قریب اسی مضمون کا شعر غالب نے نہایت نازک کہا ھے سہ

نویدِ امن ھے بیدادِ دوست جاں کے لئے
رھی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

ذوق

نہ دل رھا نہ جگر، دونوں جل کے خاک ھوئے
رھا ھے سینہ میں کیا چشم خونفشاں کے لئے

غالب

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ھے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگاں خونفشاں کے لئے

غالب کے شعر میں ایک قسم کی جدّت ھے اور ذوق نے بالکل معمولی طور پر ایک پامال مضمون کو نظم کر دیا ھے ۔

لکھنئو کے استادوں میں آتش کا مرتبہ بہت بلند ھے اور صفائی کلام کے اعتبار سے وہ اپنے لکھنوی ھمعصر ناسخ سے بہت آگے ھیں ،

لیکن غالب کی بات ان میں بھی نہیں ۔ اصل یہ ہے کہ غالب چونکہ عامیانہ تقلید سے قطعی متنفر تھے، اس لئے ان کا ہر شعر جدت کا پہلو لئے ہوتا ہے اور یہ صفت کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں۔ آتش کہتے ہیں ؎

جب اشتیاق لکھا ہے خونخوار یار کو
قاصد کا کشتہ آیا ہے خط کے جواب میں

اگرچہ اشتیاق کی تعریف خونخوار زیادہ موزوں نہیں، تاہم شعر صاف ہے، لیکن غالب نے ''جواب'' کا قافیہ نرالا باندھا ہے ۔ لکھتے ہیں ؎

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اس شعر کا مضمون سادہ ہونے کے باوجود کس قدر بلیغ ہے ۔ محبوب کی مزاج شناسی کی تمثیل اس سے زیادہ دلچسپ ہو نہیں سکتی۔ اس زمین میں غالب نے دو غزلہ کہا ہے اور بعض قافیے تو نہایت ندرت کے ساتھ نظم کئے ہیں ۔ دیکھئے ؎

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
میں اور حظِ وصل! خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

غالب کے دیوان میں ایسے اشعار معقول تعداد میں نکل سکتے ہیں جو بلاغت اور وسعت معنی کے اعتبار سے عدیم النظیر ہیں۔ انصاف پسند صائب نے غنی کشمیری کا یہ شعر ؎

سبز خطے بخطِ سبز مرا کرد اسیر
دام همرنگ زمیں بود گرفتار شدیم

سن کر اپنا سارا کلام اس کے عوض میں دے دینا منظور کیا تھا ۔ اسی طرح حقیقت ہیں شعراء کے لئے اپنے دیوان کے دیوان غالب کے ایک ایک شعر پر نثار کر دینا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ دو چار شعر ہم یہاں اس قبیل کے لکھتے ہیں جن سے مصنّف کے ذہن کی بلندی اور طبیعت کا معنوی عمق معلوم ہو جائے گا ـــ

وفاداری بشرطِ استواری عین ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

سنبھلنے دے مجھے اے نا امیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولٰی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

دیکھئے پاتے ہیں عشّاق بتوں سے کیا فیض
اک برھمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
اک کھیل ہے اورنگِ سلیمان مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے
جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وھم نہیں ھستئ اشیا مرے آگے
مت پوچھ کہ کیا حال ہے تیرا مرے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

شاذو نادر مثالیں غالب کے کلام میں ایسی مل سکتی ھیں جو مذاقِ سلیم کے خلاف ہو سکتی ھیں ۔ مثلاً

پینس میں گزرتے ھیں جو کوچہ سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ھم ھی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایکدن

لیکن شکر ہے کہ مجموعی حیثیت سے ان کا کلام بداخلاقی کے الزام سے بری ہے۔

غالب کا اردو کلام بہت مختصر ہے اور جو کچھ انھوں نے کہا تھا اور نظری اشعار خارج کر دینے کے بعد جو قائم رہا، اس میں بھی عجیب تفرقہ پڑا ہے۔ اب بھی اکثر ان کا غیر مطبوعہ کلام کہیں کہیں مل جاتا ہے۔ ہندوستان کے بعض مقامات کے قدیمی کتب خانوں میں دیوانِ غالب کے ایسے نسخے موجود ھیں، جن میں سے اکثر خود مصنف کی نظر سے گزر چکے ھیں۔ مروجہ دیوان سے جب ان کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اوّل الذکر میں کلام کا ایک حصہ بالکل موجود نہیں۔ عرصہ ہوا رسالۂ مخزن میں ایک نظم ''طائر دل'' کے عنوان سے نکلی تھی، جو حسب ذیل ہے :-

اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوش وحشت میں
پھرا اسیمہ سر، گھبرا گیا تھا دل بیاباں سے
نظر آیا مجھے اکہ طائرِ مجروح پر بستہ
پٹکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے
کہا میں نے کہ او ناکام! آخر ماجرا کیا ہے
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے
ھنسا کچھ کھل کھلا کر پہلے، پھر مجھکو جو پہچانا
تو یوں رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے
کہا میں صید ھوں اس کا کہ جس کے دام گیسو میں
پھنسا کرتے ھیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے
اسی کے زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے
بچشمِ غور جب دیکھا، مرا ھی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ھو گیا یوں خاک اپنی آہِ سوزاں سے